شناسائی



ملک مقبول احمد



شناسائی

ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ، چوک اُردو بازار، لاہور

11 0959

اشاعت اول 2011ء

اہتمام ملک مقبول احمد

ناشر مقبول اکیڈمی

سرورق انیس یعقوب

مطبع خورشید مقبول پریس

قیمت چارسو پچاس روپے

ISBN-978-969-510-412-5

MAQBOOL ACADEMY
Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
Ph:042-37324164, 37233165, Fax:042-37238241

10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.
Ph:042-37357058, Fax:042-37238241
Email:maqbool@brain.net.pk

ڈاکٹر طارق عزیز

''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے''

سعید بدر

''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''

ناصر نقوی

''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی''

حصہ اول

سفر جاری ہے

فہرست

عرضِ سدید

''پذیرائی کے بعد اب ملک مقبول احمد اہل ادب کے سامنے نئی کتاب ''شناسائی'' کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔ تو میں اپنی اس حیرت کو چھپا نہیں سکتا کہ ان کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کو جو ایک بالکل سادہ سی آپ بیتی ہے اتنا قبول عام کیسے حاصل ہوا؟''

اس کتاب کو اہل ادب نے التفات کی نظر سے دیکھا اور ملک صاحب کو کتاب کی رسید کے طور پر خطوط لکھے تو میں نے اسے ایک رسمی عمل قرار دیا۔ جو ہر با اخلاق شخص کتاب کا تحفہ ملنے پر از خود اختیار کرتا ہے لیکن پھر اس کتاب پر ہندو پاک سے مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ اور ایک نئی کتاب ''پذیرائی'' معرض وجود میں آ گئی۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ معروف انشائیہ نگار اور دانشور جناب پروفیسر جمیل آذر کو ''سفر جاری ہے'' نے اتنا متاثر کیا کہ ان کا قلب جاری ہو گیا اور ان کی اپنی دیہی زندگی کی فلم ان کی نظروں کے سامنے چلنے لگی اور انہوں نے ایک کتاب ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے لکھی جس میں بظاہر انہوں نے ''سفر جاری ہے'' پر تبصرہ لکھا ہے لیکن غور کیجئے تو انہوں نے اپنی زندگی کے سفر کی داستان بھی بیان کر دی ہے۔ جو ملک مقبول احمد کی زندگی سے مختلف نہیں بلکہ دو آپ بیتیاں ..... ایک بلاواسطہ اور دوسری بالواسطہ...... دراصل ہر اس دیہی انسانی کی کہانی ہے۔ جس نے دیہات کی پسماندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے شہر کی طرف پیش قدمی کی اور عمل حیات میں

سرگرم حصہ لیا۔ ملک مقبول احمد کتابوں کے ممتاز ناشر بن گئے۔ پروفیسر جمیل آذر محکمہ تعلیم میں ایک اونچے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے لیکن اس دوران وہ ادبی دنیا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکے تھے اور ان کی کتابوں سے اب نئی نسل استفادہ کر رہی ہے۔ گویا اس خلوص کے کلام میں تازگی جاوید ہے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ "سفر جاری ہے"، "پذیرائی" اور "راہ نورد شوق" کی اس بے پایاں مقبولیت کا راز کیا ہے؟ میرے خیال میں بنیادی وجہ تو ملک مقبول احمد کے برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیبوں سے روابط ہیں جو کتاب کی طباعت و اشاعت اور پھر تقسیم تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ ذاتی دوستی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے قبل کسی ناشر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری شائع نہیں کی۔ ملک مقبول احمد نے اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب پیش کی تو اس نے ہر پڑھنے والے کو متاثر کیا۔ اب مجھے یہاں بھارت کے ممتاز مصنف نراد چودھری یاد آ رہا ہے۔ جس نے اپنی خودنوشت کا نام "ایک عام آدمی کی سرگزشت" رکھا اور یہ عنوان اتنا انوکھا تھا کہ اس عام آدمی کے حالات حیات پڑھنے کے لیے ہر شخص بے تاب ہو گیا۔ ملک مقبول احمد کی آپ بیتی نے بھی ایک ناشر کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کے پیش الفاظ جب ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید، شعیب بن عزیز، طارق اسماعیل ساگر، ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم، سید واجد رضوی، قمر نقوی اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک نے لکھے تو کتاب پڑھنے والے ہر ادیب نے سوچا کہ میں اس برادری کے ارکان سے کیوں پیچھے رہوں۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنے مطالعے کے ثمرات ملک مقبول احمد صاحب تک پہنچانے کی کاوش کی۔ آخری بات یہ ہے کہ ملک مقبول احمد کو ان کے کسی مخلص دوست نے مشورہ دیا کہ جن دوستوں نے ان کی کتاب پر تبصرے لکھے ہیں۔ ان کے تعارف نامے بھی

کتاب میں شامل کرلیں۔ چنانچہ ملک صاحب نے ہر قلم کار کا تعارف ان کے اوصاف کی روشنی میں کرایا تو یہ سب اتنے پسند کیے گئے کہ متعدد لوگوں کو اپنے بارے میں ملک صاحب کی رائے جاننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک صاحب کے باطن سے ایک مولف اور مصنف برآمد ہو گیا اور کتاب سے کتاب بنتی چلی گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گمشدہ رسالے ''چودھویں صدی'' سے تین کتابیں ''گلشنِ ادب''، ارمغان غزل'' اور گمشدہ افسانے'' برآمد کیں۔ ترکی سے وطن واپس آئے تو ''سیاحت نامۂ ترکی'' میں اپنے مشاہدات جمع کیے۔ کچھ دوستوں کی فرمائش پر ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کو اپنے روابط کی روشنی میں خاکہ نگاری کا موضوع بنایا۔ فلاح و بہبود عامہ کے لیے اسلامی کتابوں کی بلاقیمت تقسیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ادیبوں کی صف میں اس وقت شامل ہوئے جب انہیں فرصت میسر آ گئی تھی اور اشاعتی کاروبار ان کے ہنرمند بچوں نے سنبھال لیا تھا۔ مجھے علم ہے کہ ملک صاحب کے پیش نظر کئی تالیفی اور تصنیفی منصوبے ہیں۔ میں ان کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں اور آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ ان کے ارادوں کی تکمیل کے لیے اپنی نیک خواہشات کے ساتھ یاد فرمائیں۔

انور سدید

172۔ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن لاہور، (54570)

فون:0334-9719278

پیش لفظ

میری آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' چھپ کر آئی تو اسے اہلِ ادب نے بے حد پذیرائی عطا کی۔ ڈاکٹر صفدر محمود، اے حمید، علی سفیان آفاقی، شعیب بن عزیز، ڈاکٹر طارق عزیز، ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم اور ڈاکٹر انور سدید جیسے نامور ادیبوں نے اس کتاب کے پیش الفاظ لکھے لیکن پھر پاکستان اور ہندوستان کے اکثر مقامات سے خطوط اور تبصرے آنے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ محبت اور دیانت سے گزاری ہوئی زندگی کا اپنا ایک جادو ہے۔ اس زندگی کے تذکرے میں پڑھے جانے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ بعض لوگوں کی رہنمائی بھی کر سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اُردو ادب کے نامور مصنف، انشائیہ نگار اور دانشور پروفیسر جمیل آذر نے میری دیہاتی زندگی میں اپنے گاؤں کی زندگی کے نقوش دیکھے اور ایک کتاب ''راہ نوردِ شوق'' کے نام سے لکھی جس میں میری کتاب پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اور اس عمل میں انہوں نے اپنے آپ کو بھی دریافت کیا اور اپنی خودنوشت بھی لکھ ڈالی۔

ڈاکٹر انور سدید اور جناب آصف بھلی کی رائے کے مطابق ایسی کتاب انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ''سفر جاری ہے'' پر اخبارات اور اہلِ ادب دوستوں کے تبصروں پر مشتمل کتاب ''پذیرائی'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں ادیبوں کے سوانحی خاکے بھی موجود ہیں۔ کئی صاحب علم دوستوں کے مطابق اس کتاب میں ادب کے طالب علموں کے لیے بہت سا مواد موجود ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ متذکرہ دو کتابوں کے چھپنے کے بعد بھی اربابِ ادب کے

خطوط اور ''سفر جاری ہے'' پر تبصروں کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی اخبارات اور رسائل میں تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا۔ ''راہ نوردِ شوق'' (مؤلفہ پروفیسر جمیل آذر) پر تبصروں کی کیفیت الگ ہے لیکن ان کا تعلق بھی کسی نہ کسی صورت میں سابقہ دو کتابوں سے قائم ہوتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ سب ''شناسائی'' کے نام سے ایک الگ کتاب میں جمع کر دیئے جائیں۔ اُمید ہے کہ ادب کے طالب علم پہلی دو کتابوں کی طرح اس سے بھی مستفید ہوں گے اور اسے پسند کریں گے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ملک مقبول احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

DR. A. Q. KHAN
N I & BAR, HI

"Mountain View"
207, Hillside Ro[ad]
E-7, Islamabad
Pakistan

Date: 24.1.[..]

سفر جاری ہے۔ مصنفہ ملک مقبول احمد

۔ تبصرہ ۔

جناب ملک مقبول احمد صاحب کی نہایت دلچسپ کتاب بلکہ
سوانح حیات "سفر جاری ہے" جب کھولی تو بند کرنا مشکل
ہوگیا۔ آپ نے دوستوں بزرگوں کے بارہ میں نہایت
دیانتداری سے سیدھے سادے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے بہت
سے حضرات سے میری بھی شناسائی رہی ہے اور میں ملک صاحب
کی گہری نظر اور مردم شناسی کی درخشاں مثال ہے۔ حالی نے شاید
ملک صاحب کے لئے یہ پیارا شعر کہا تھا۔

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی ہے۔ آپ
نے ایک طویل دلچسپ سفر کو بند کر کے ایک دریا کو تاریخ کے ایک کوزے
میں بند کر دیا ہے۔ آپ کا پبلشنگ ادارہ "مقبول اکیڈمی" ایک اہم قومی ادارہ
بن گیا ہے جس کی زندہ مثال اس ادارہ کی گیارہ سو زیادہ شائع کردہ مطبوعات
ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنا فن علم اور
تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ
ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لئے مشعل راہ بنائے رکھے۔ آمین

ڈاکٹر عبدالقدیر خان



بانو قدسیہ

تشکیلِ پاکستان کے بعد اردو افسانے میں بانو قدسیہ کا ظہور اس لیے خوش آئند ہے کہ ان کے بعد خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے افسانے کی صنف کو قبول کر لیا تھا۔ ان میں جمیلہ ہاشمی، فرخندہ لودھی، سائرہ ہاشمی اور اختر جمال سے لے کر طاہرہ اقبال خالدہ حسین، شمع خالد، عذرا اصغر، شبہ طراز، نیلما ناہید درانی اور کئی دوسرے خواتین شامل ہیں اور یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ بانو قدسیہ اردو افسانے میں ایک نئے دور کی نوید ثابت ہوئیں۔ بلاشبہ ان کے افسانوں کا اہم ترین موضوع متوسط طبقے کی عورت ہے جو مرد کے جبر کا شکار ہے اور دُکھ اُٹھا رہی ہے۔ تاہم انہوں نے اس مظلوم عورت کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیا اور زندگی کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا سبق دیا۔ بانو قدسیہ کے افسانوں میں لاہور کی تہذیبی زندگی کے نقوش افسانے کے تناظر میں محفوظ ہوتے چلے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بازگشت، امر بیل، کچھ اور نہیں، دوسرا دروازہ، آتش زیرِ پا، ناقابلِ ذکر، سامانِ وجود بہت مشہور ہے۔ بانو قدسیہ نے اردو ناول کی تخلیق کا بیڑہ اٹھایا تو "راجہ گدھ" جیسا کلاسیکی ناول پیش کیا۔ "موم کی گلیاں"، "پروا"، "شہرِ بے مثال" اور "حاصل گھاٹ" ان کے چند معروف ناولوں کے عنوان ہیں۔ بانو قدسیہ نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے کئی زندہ جاوید سیریل اور ڈرامے لکھے اور ادب، صحافت میں "داستان گو" جیسا رسالہ پیش کیا۔ "مرد بریشم" ان کی خاکہ نگاری اور شخصیت نویسی کا نقشِ لطیف ہے۔ اشفاق احمد کی وفات کے بعد انہیں اپنی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا تو انہوں نے "راہِ رواں" جیسی کتاب لکھنی شروع کر دی جو آپ بیتی ہے لیکن دوسری سطح پر اشفاق احمد کا تذکرہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بانو قدسیہ نے مقبول اکیڈمی کی مطبوعات کو ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو شاندار پذیرائی ملی۔ بلاشبہ محترمہ قدسیہ میری نہایت محترم "بانو آپا" ہیں۔ خدا انہیں صحت مند عمرِ خضر عطا کرے۔ (آمین)



بانو قدسیہ

داستان سرائے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

"سفر جاری ہے"

ملک مقبول احمد صاحب کی خودنوشت پڑھنے کو ملی۔ اس کتاب کے شروع میں اُنہوں نے "روسو" کی تحریر سے جو اقتباس درج کیا ہے۔ یہ کتاب اس پر پوری اُترتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ جب بزرگی عمر کو پہنچتے ہیں۔ تو وہ اپنی کامیابیوں سے اتنے معزز ہو جاتے ہیں کہ پھر اپنی ذات کے بارے میں سچ بولنا اور لکھنا اُن کے لیے بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ مقبول صاحب نے اپنی ذات کے بارے میں سچ تو ضرور بولا ہے لیکن بڑی سادگی کے ساتھ۔ اُنہوں نے ذاتی سچ کو افسانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔

میری ساری زندگی اپنے ذاتی اور ادبی دوستوں کے ساتھ اس بحث میں گزری کہ وہ اپنے بارے میں سچ ضرور بولیں لیکن دوسرے کے پوتڑے سرِ راہ دھونے سے اجتناب برتا کریں۔ مقبول صاحب کو جن لوگوں کے نامناسب رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اس کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن اُن لوگوں کے نام ظاہر نہ کر کے اعلیٰ درجے کی شرافت کا ثبوت مہیا کیا ہے اس شرافت کا تعلق ان کی اپنی ذات سے بھی ہے اور ان کی وراثت سے بھی۔ زندگی میں ہمیں ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے۔ جو کچھ خوبیوں کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ مقبول صاحب نے بھی ایسے چند لوگوں سے ہمیں روشناس کروایا

ہے۔ان کا نام بھی بتایا ہے۔اوران کی زندگی کی پہچان بھی کروائی ہےاور وہ لوگ جس جگہ یا مقام پر زندگی بسر کرر ہے ہیں۔اس کو ظاہر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا ــــ مثال کے طور پر صفحہ نمبر 74 پر درج ہے کہ سنتالیس کے فسادات میں جموں کی سرحد سے کچھ لوگ پاکستان آ گئے تھے۔ان میں چھوٹے بچے بھی تھے۔جن کے والدین جموں میں قتل ہو گئے تھے۔ایک لڑکے اورلڑکی کو میری پھوپھی چراغ بی بی نے اپنی گود میں لے لیادونوں ہمارے گھر میں بڑے ہو گئے۔لڑکی کا نام "سرداراں" تھا۔پھوپھی نے اس کا نکاح اپنے بھتیجے خورشید احمد سے کر دیا۔ سرداراں کا بھائی جس کا نام محمد عالم ہے۔بہت ذہین اور زندہ دل آدمی ہے۔کچھ عرصہ یہ میرے پاس لاہور بھی رہا ہے۔پھر واپس گاؤں چلا گیا تھا۔اس کی شادی ہوئی لیکن نباہ نہیں ہو سکا۔آج کل یہ کسی گاؤں کی ایک درگاہ میں کسی بزرگ کے پاس اللہ اللہ کر رہا ہے۔"



محمد آصف بھلی

محمد آصف بھلی کا پیشہ وکالت ہے اور وہ سیالکوٹ کے نامور قانون دانوں میں شمار ہوتے ہیں، لیکن انہوں نے پہلی محبت ''صحافت'' سے کی اور اس کے ساتھ وفاداری کو استواری کی شرط کے ساتھ اصل ایمان سمجھتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ وہ ''چوتھا ستون'' کے نام سے روزنامہ ''پاکستان'' اور ''نوائے وقت'' میں اب تک باقاعدگی سے کالم لکھ رہے ہیں۔ رزق حلال وکالت سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے اپنی آواز کے خود محافظ ہیں اور کوئی سیاستدان، حکمران انہیں خرید نہیں سکا۔

آصف بھلی 5 اپریل 1955ء کو رسول پور بھلیاں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ صحافت میں ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا، قانون کی تعلیم لاء کالج لاہور اور کراچی یونیورسٹی سے مکمل کی، طالب علمی کے زمانہ میں ہی علمی صحافت کی طرف آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے رسالہ ''محور'' اور لاء کالج کے رسالہ ''المیزان'' کی مجلس ادارت میں شمولیت کے علاوہ وہ آغا شورش کاشمیری کے مشہور ہفت روزہ ''چٹان'' میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سیالکوٹ میں سیکرٹری اور صدر کی خدمات سر انجام دیں، سیالکوٹ میں کئی دفعہ کل پاکستان مشاعرہ کا اہتمام کیا اور مشاعروں میں نظامت کے فرائض سرانجام دیئے۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آپ شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، کالم نگار ہیں، تنقید نگار ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل یعنی ہر فن مولا ہیں۔ سیالکوٹ کے ایک خوبصورت جریدے ''سیالکوٹ مرر'' میں بھی آپ مضامین لکھتے ہیں جنہیں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کالموں کا مجموعہ ''چوتھا ستون'' کے علاوہ ''جمہوریت سے ملاقات''، ''سیاستدان''، ''سیاست کے روبرو''، ''چوتھے ستون سے مکالمہ''، ''شعر کے سورنگ''، ''جب میرا انتخاب نکلے گا''، ''صدی کی منتخب غزلیں''، ''اشعار کا دفتر کھلا''، ''میں نے شاعری کو دیکھا'' اور ''غزلیات میر'' کے نام سے گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سفر جاری ہے پر ان کا تبصرہ ان کا ذاتی اظہار ہے، لیکن مجھے اس میں دوستی کی خوشبوئے جاں فزا ہی محسوس ہوتی ہے۔ آصف بھلی کا تعلق چونکہ رسول پور بھلیاں سے ہے، جو میرے گاؤں دیووال کی ہمسائیگی میں واقع ہے، اس پس منظر میں ان کی تحریر پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک بار پھر اپنے بچپن اور نوجوانی میں رسول پور بھلیاں اور دیووال کی فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں۔



چوتھا ستون

محمد آصف بھلی

ایک ناقابلِ فراموش کتاب

ملک مقبول احمد اگرچہ سیالکوٹ میں میرے گاؤں رسول پور بھلیاں میں زیرِ تعلیم رہے اور اُن کا تعلق بھی میرے گاؤں کے قریب ہی واقع ایک گاؤں دیووال سے ہے لیکن عمروں کے تفاوت کی وجہ سے اُن سے میری براہ راست صاحب سلامت اور جان پہچان بہت کم ہے۔ میرے شعور سنبھالنے سے بہت پہلے وہ لاہور منتقل ہو چکے تھے اور وہاں انہوں نے کتابیں شائع کرنے والے اپنے ادارے کی بنیاد رکھی جو اب پاکستان کے چند بڑے اشاعتی اداروں میں سے ایک ہے۔

ملک مقبول احمد کی اشاعتِ کتب کے حوالے سے انفرادیت یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ناول، افسانوں کی کتب اور شعری مجموعے شائع کر کے ادب کے فروغ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے وہاں کتابیں شائع کرتے ہوئے ان کی ہمیشہ سے یہ ترجیح رہی ہے کہ اسلام اور پاکستانیت کے موضوع پر بہت ہی معیاری کتابیں شائع کی جائیں۔ ملک مقبول احمد کا یہ شعوری فیصلہ نئی نسل کو ایک اچھا مسلمان اور محبِ وطن پاکستانی بنانے کی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔ اس اعتبار سے ملک مقبول احمد کا کردار دوسرے ناشرین کے لیے بھی قابلِ تقلید ہے۔ ہمیں اپنی سمت درست رکھنے کے لیے ایسے نظریاتی لٹریچر کی حد درجہ

ضرورت ہے جو اسلام کی اساسی تعلیمات پر مشتمل ہو اور جو نظریہ پاکستان کا مظہر ہو۔ اسلام اور پاکستانیت کے موضوع پر ملک مقبول احمد اپنے ادارے مقبول اکیڈمی کی طرف سے جو کتابیں شائع کرتے ہیں ان میں سے کچھ منتخب کتب ملک مقبول احمد بڑی فراخدلی سے طالبعلموں، اساتذہ اور مختلف تعلیمی اداروں کو مفت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی اس غیر تاجرانہ روش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ابتدائی سطور میں مَیں نے گزارش کی تھی میری ملک مقبول احمد سے براہ راست واقفیت بہت کم ہے۔ لیکن میری اُن سے ابھی تک جو ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ اُس ملاقات سے میں نے محسوس کیا کہ ملک صاحب ایک سراپا محبت اور خلوص سے بھرے ہوئے انسان ہیں۔ اُن سے مل کر مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ کسی شخص سے میری پہلی ملاقات ہے۔ ایک عجیب طرح کی جاذبیت اور کشش میں نے اُن کی شخصیت میں محسوس کی۔ اُن کی باتوں میں جو خوشبو تھی اُس میں اُن کی سچائی اور سادگی رچی بسی ہوئی تھی۔ ان سے پہلی ہی ملاقات میں اجنبیت کا احساس نہ ہونے کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس ملاقات سے پہلے میں اُن کی کتاب ''سفر جاری ہے'' پڑھ چکا تھا۔

''سفر جاری ہے'' اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے کہ اس کتاب کے لکھنے والے کو ادیب ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں لیکن کتاب پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحریر پر ملک مقبول احمد کی گرفت جتنی مضبوط ہے لکھنے پر ایسی دسترس کسی بڑے سے بڑے جغادری ادیب کو بھی کیا حاصل ہو گی۔ ملک مقبول احمد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز چونکہ میرے آبائی گاؤں رسول پور بھلیاں کے گرد ونواح سے کیا اس لیے ان کی کہانی کا بہت سارا حصہ مجھے اپنی داستان ہی کا ایک باب محسوس ہوا۔ اس کتاب کو پڑھنے ہی سے مجھے علم ہوا کہ رسولپور بھلیاں کا مڈل سکول آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ایک مثالی ادارہ تھا جہاں پڑھنا ملک مقبول احمد جیسی

شخصیت کے لیے بھی باعث فخر ہے۔خود رسولپور بھلیاں کے لیے بھی یہ امر لائق افتخار ہے کہ وہاں کے ایک سکول میں زیر تعلیم رہنے والی شخصیت کو آج نہ صرف بطور پبلشر پورا ملک اور پوری قوم ملک مقبول احمد کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے بلکہ ملک مقبول احمد کی پہلی کتاب ''سفر جاری ہے'' کی پذیرائی پاکستان بھر کے نامور لکھنے والوں نے انتہائی بھرپور انداز میں کی ہے۔

''سفر جاری ہے'' کے مندرجات اور اسلوبِ تحریر کی تعریف پاکستان کے چوٹی کے لکھنے والوں نے کی ہے۔اور اس کتاب کے حوالے سے اتنی زیادہ تعداد میں مضامین اور کالم تحریر کیے گئے ہیں کہ ان مضامین اور کالموں کو ترتیب دے کر ''پذیرائی'' کے نام سے 460 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرتب کی گئی ہے۔''سفر جاری ہے'' جنوری 2007ء میں شائع ہوئی تھی اور ''پذیرائی'' جنوری 2008ء میں شائع کی گئی۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کتنے کم عرصہ میں کتنی زیادہ مقبولیت ملک مقبول احمد کی پہلی ہی کتاب کے حصے میں آئی۔اب سننے میں آیا ہے کہ ملک مقبول احمد کی پہلی کتاب ہی کے حوالے سے ایک بڑی تعداد میں اور مضامین بھی سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔جن کو ایک نئی الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ملک مقبول احمد شاید اس ملک کے واحد خوش قسمت ایسے مصنف ہیں جن کی خودنوشت پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہے۔ایسی پذیرائی ایسا خیر مقدم ایسی محبت بہت ہی کم مصنفین کا مقدر ہوتی ہے۔میرے نزدیک سچائی اور سادگی دو ایسی خوبیاں ہیں جن کے باعث ''سفر جاری ہے'' لکھنے پر ملک مقبول احمد کو اتنے بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ملک مقبول احمد کی اس قابلِ رشک مقبولیت کو میں اپنے شہر سیالکوٹ کی پیشانی کا جھومر سمجھتا ہوں۔حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ملک مقبول احمد نے اپنے علم اور اپنے قلم کی جولانیوں کے جھنڈے ہر طرف گاڑ کر ثابت کر دیا ہے کہ سیالکوٹ کی دھرتی اب بھی بہت زرخیز ہے۔ ملک مقبول احمد کی کامیابیوں نے روحِ اقبال کو بھی سرشار کر دیا ہوگا۔ میں ملک مقبول احمد کو ''سفر جاری ہے'' جیسی منفرد کتاب لکھنے پر مبارک باد دیتا ہوں اور اُن سے آئندہ بھی ایسے ہی کارناموں کی امید رکھتا ہوں۔ میں آخر میں ایک بار پھر حضرت علامہ اقبال ہی سے مدد لینا چاہتا ہوں اور ملک مقبول احمد کے حوالے سے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے علامہ اقبال کا ایک مصرع تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اپنے قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

''مقبول بھی مقبول سے آگاہ نہیں ہے''

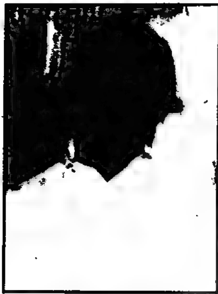
میری نظر میں خود ملک مقبول احمد بھی اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ انہوں نے ''سفر جاری ہے'' کی صورت میں کیسی ناقابل فراموش کتاب تحریر کر ڈالی ہے۔



جبّار مرزا

جبّار مرزا ادب وصحافت کا ذوق لے کر یکم اکتوبر 1948ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ جو اس زمانے میں راولپنڈی کے ایک محلے کا نام تھا۔ ان کے والد کا نام بدرالدین ہے۔ وہ برٹش آرمی کے محکمہ سپلائی میں صوبیدار تھے۔ اپنے فرائض اتنی دیانتداری سے ادا کرتے تھے کہ 1946ء میں ریٹائر ہوئے۔ تو انہیں دو مربعہ اراضی ضلع رحیم یار خان میں انعام دی گئی اور برما کے محاذ پر اعلیٰ خدمات انجام دینے پر ایوارڈ دیا گیا۔ جبّار مرزا کی طبیعت نے زمینداروں کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے ہل کی بجائے قلم تھام لیا۔ ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں چک لالہ کے سی بی اے سکول سے حاصل کی اور ایم اے اُردو 1976ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ قلم وقرطاس کی محبت شروع سے دل میں پرورش پانے لگی تھی۔ شورش کاشمیری ان کی تحریروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اسلام آباد میں "چٹان" کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر بنا دیا۔ یہ تجربہ اتنا سودمند ثابت ہوا کہ ان کے قلم کے گھوڑے ادب کے ہر میدان میں فتوحات حاصل کرنے لگے۔ اسلام آباد کے معروف اخبار "مرکز" کی تین سال تک ادارت کی۔ اسی دوران ماہنامہ "افتخار ایشیاء"، اخبار "مسلمان"، ماہنامہ "الکشمیر"، ماہنامہ "مواصلات"، ماہنامہ "بیسویں صدی" اور کئی دیگر رسائل واخبارات کی ادارت کی۔ متعدد نئے لکھنے والوں کو ادب کے آسمان کا تابندہ ستارہ بنایا۔ سینئر ادیبوں کی مؤدبانہ پذیرائی کی۔

جبّار مرزا کی شاعری کے دو مجموعے "مرحلے" اور "فاصلے" کے عنوانات سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے اخباری کالموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔



جبار مرزا

آئی ٹین ون۔اسلام آباد

ملک مقبول احمد صاحب!

زندگی مسلسل سفر کا نام ہے، روانی میں ہی جاودانی ہے، سفر جاری رکھیے، تاکہ آپ کے قافلے میں ہم ایسے نوواردوں کا ولولہ تازہ رہے۔"اہل قلم کے خطوط" گواہ ہیں کہ آپ نے ناشر اور پبلشر میں موجود "شر" کو شرافت میں بدل دیا ہے۔

آپ کی سوانح "سفر جاری ہے" میرے لیے فردوس نظر بنی، جس مہارت سے زندگی کے مشاہدات و تجربات کو آپ نے قرطاس پر اتارا ہے، لائق تحسین ہے۔ میرے لیے یہ بات بھی کسی کرامت سے کم نہیں کہ ساغر صدیقی کی پوری زندگی کو آپ نے پندرہ سطروں میں بیان کر دیا ہے۔

آپ نے زبیدہ آپا کی طرح داغ دھبے اتارنے کے لیے بعض ٹوٹکے بھی بے نیازی میں لکھ دیئے ہیں جیسے دانتوں کو صاف رکھنے کے لیے گنا چوسنا، ملک صاحب آپ کی تحریر کی سلاست نہ صرف آپ کے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ بلکہ بلاغت اور فراست کا خوبصورت امتزاج بھی ہے۔!!

گزشتہ دنوں میں نے آپ سے ٹیلیفون پر بات اس لیے کی تھی کہ مجھے بھی احمد ندیم قاسمی کی طرح تجسس تھا کہ:

میں تیرا حُسن، تیرے حسنِ بیاں تک دیکھوں!!

علامہ عبدالستار صاحب عاصم بہت محبت سے آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، آپ جب ان کے لیے دعا کیا کریں تو مجھے بھی یاد رکھیئے گا! اپنی غزل کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ:

میں نے اپنی روشنی کو دور تک پھیلا دیا
جب سنا میں نے ہوا سے یہ دیا کچھ بھی نہیں

☆☆☆

ملک محمد محبوب الرسول قادری

جناب ملک محمد محبوب الرسول قادری کی پیدائش 1965ء اور تعلق جوہر آباد سے ہے۔ آپ کا خاندانی پس منظر امیر المومنین سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کے فرزند ارجمند حضرت محمد بن حنیفہ کی اولاد یعنی اعوان قبیلہ سے ہے۔

آپ کے اجداد کرام وادیٔ سون کے پہاڑوں سے اُتر کر تاریخی گاؤں 'ٹبولا شریف' آئے یہاں ان کے جدِ امجد حضرت مولانا حافظ سیّد رسول شہید شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی بادشاہی مسجد کے خطیب تھے اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے معروف پیشوا حضرت خواجہ خواجگان خواجہ غلام حسن سواگؒ کے نہایت معتمد، منظور نظر اور مقرب مریدین میں سے تھے۔ یوں سلسلہ رُوحانیت اور دینی خدمات کا سلسلہ نسل در نسل جاری و ساری ہے۔ ان کے والد گرامی جناب ملک عبدالرسول قادری نے ساری زندگی ملک وملت، خطے اور سماج کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ عمِ محترم حضرت شیخ طریقت قطب العصر مولانا حافظ عبدالغفور قادری رحمۃ اللہ علیہ معروف رُوحانی پیشوا عالم دین اور دینی رہنما کی حیثیت سے ملک بھر میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مزار 94 شمالی سرگودھا مرجع خلائق ہے ہزاروں سالکانِ راہِ تصوف کے لیے عقیدت ومحبت کا مرکز ہے۔

آپ نے گریجوایشن ایم اے اسلامیات، عربی جوہر آباد سے کیا۔ درس نظامی جامعہ قادریہ فاضلیہ تکمیل تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان لاہور، نیشنل کونسل فار طب اسلام آباد کے کوالیفائیڈ حکیم حاذق ہیں۔

ماہنامہ سوئے حجاز لاہور کے مدیر ہیں جو گزشتہ 18 برس سے باقاعدہ چھپ رہا ہے۔ سہ ماہی "انوارِ رضا" جوہر آباد کی ادارت بھی آپ کے ذمہ ہے۔ جو گذشتہ پانچ سال سے چھپ رہا ہے۔

آپ کی مختلف موضوعات وعنوانات پر لکھی ہوئی 38 کتب متعدد اداروں نے شائع کی ہیں۔

ایک ہزار سے زیادہ مختلف موضوعات پر مضامین مقالات، مراسلات، اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ملک کے چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور قبائلی وشمالی علاقہ جات میں تبلیغی و سیاحتی دورے کے علاوہ سعودی عرب، لیبیا، متحدہ عرب امارات کے دورے بھی کر چکے ہیں۔

انجمن طلباء اسلام کے ساتھ بارہ سال اور پھر جمعیت علماء پاکستان کے ساتھ بلکہ جمعیت علماء پاکستان کی مرکزی شوریٰ کے رکن بھی ہیں۔

مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبدالستار خان نیازی اور دُنیا بھر کی اہم علمی اور دینی شخصیات سے روابط وتعلقات ہیں۔



ملک محمد محبوب الرسول قادری

"انوارِ رضا" جوہر آباد

چراغِ استقامت جل رہا ہے

ملک مقبول احمد۔۔۔۔۔۔استقامت اور جہدِ مسلسل کا استعارہ۔۔۔۔۔۔ایک شعوری انسان۔۔۔۔۔مشنری جذبے سے سرشار۔۔۔۔جس کے شوق، رزق اور مشن کی سرحدیں حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔۔

اردو بازار لاہور۔۔۔۔کے ناشرین میں قدیم، معیاری اور فکری و نظری ادارہ مقبول اکیڈمی۔۔۔۔جو آج بھی علم و عرفان کی شمع روشن رکھے ہوئے ہے۔۔۔جو ایک سادہ، باوقار، روایت ساز اور خاندانی پسِ منظر کے حامل علم دوست انسان کی نصف صدی پر محیط انتھک اور مسلسل جدوجہد کا خوبصورت ثمر ہے۔۔۔اس ادارے کا کام دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

معیاری کتب کے انبار۔۔۔ایک شخص کی خوابیدہ صلاحیتوں کا اعتراف۔۔۔دنیا بھر کے اہلِ علم و اصحابِ قلم کا اعترافِ عظمت۔۔۔۔باصلاحیت افراد کی یکسوئی کے ساتھ ایک ہی جانب کامل توجہ۔۔۔۔"پذیرائی"، "راہ نوردِ شوق" اور "اہلِ قلم کے خطوط" معاشرے کی سرکردہ، بزرگ، جینئس اور صادق و امین ہستیوں کی شہادتیں، گواہیاں اور

خراجِ تحسین ہیں۔۔۔"سفر جاری ہے" حوصلوں کو تقویت اور نئی نسل کے لیے راہنمائی عطا کرنے والی کتاب ہے۔ ہر باصلاحیت کے لیے حاسدین کا پیدا ہونا فطرت کا تقاضا ہے اور ان سے تحفظ و پناہ کے لیے "سورۃ فلق" کا حصار نہایت مجرب و کارگر ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کا ویسے ورد بھی مفید ہے اور اس کی زیارت بھی پناہ ہے۔ ربِ کریم حاسدین کے حسد اور شر سے اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے۔۔۔(آمین)

مقبول اکیڈمی صرف کمرشل اشاعتی ادارہ نہیں بلکہ مشنری جذبے سے سرشار بانی ادارہ کے وجود کی برکت سے ملک وملت کے لیے نہایت مفید انسٹی ٹیوٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی بعض کتابیں بلاقیمت تقسیم کی جاتی ہیں۔ جو دوسرے اداروں کے لیے قابلِ تقلید روش ہے۔ مجھے ملک مقبول احمد صاحب سے چند ملاقاتوں میں ایک خاص اپنائیت اور خلوص کا احساس ہوا اور ایسے لگا کہ وہ اس قوم کا اجتماعی اثاثہ ہیں۔۔۔ایسے بزرگوں کی قدر افزائی ہونی چاہئے اور نئی نسل کو ان سے کسب فیض کرنا چاہئے۔۔۔۔اُن کا عجز وانکسار تو ایک مثال ہے۔

میں مکرمی ملک مقبول صاحب کے لیے صحت وسلامتی کے ساتھ لمبی عمر کی دُعا کرتا ہوں تا کہ ہمارا سماج ان سے فیض یاب ہوتا رہے۔۔

☆☆☆

علامہ عبدالستار عاصم

جناب عبدالستار عاصم کی تاریخ پیدائش پاکستان کے تاریخ پیدائش سے ہم آہنگ یعنی وہ ۱۴ اگست کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔اس وقت پاکستان ۲۳ برس کا ہو چکا تھا، یعنی یہ ۱۹۷۰ء کا سال تھا۔اس وقت ملک میں عام انتخابات کی تیاری ہو رہی تھی اور گلی کوچوں میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے نعرے گونج رہے تھے۔انہوں نے ہوش سنبھالا تو ملک مارشل لاء کے شکنجے سے نکل چکا تھا لیکن فضا میں سیاست کی برقی رو دوڑ رہی تھی۔عبدالستار عاصم نے اس رو کے جھٹکے ایم اے تک کی تعلیم کے دوران کالج کی فضا میں محسوس کیے اور پھر اس کرب سے بھی گزرے جو مارشل لاء کی وجہ سے پورے ملک پر عذاب خداوندی بن کر نازل ہو گیا تھا۔عاصم صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے قلم کو تحفظ پاکستان کے لیے استعمال کریں گے اور سرکاری نوکری نہیں کریں گے۔اس خیال کے تحت ہی انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور کالم نگاری کے علاوہ فیچر نگاری بھی کرنے لگے۔ان کے قلم میں بڑی قوت تھی۔ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ان کی رائے منفرد تھی۔وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے بے تکان لکھتے چلے جاتے۔ان کے مضامین ملک کے بے شمار ادبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی رسائل میں چھپتے اور انہیں ہندوستان کے اُردو اخبارات ورسائل بھی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے کیونکہ وہ مسلم اُمّہ کو متحد کرنے میں یقین رکھتے تھے اور ان کا مخاطب ہر خطے کا مسلمان ہوتا تھا۔ان کے مضامین کا معیار اتنا بلند تھا کہ انہیں "علامہ" تسلیم کر لیا گیا۔

علامہ عبدالستار عاصم کی تصنیفات میں "خبر قبیلہ"، "انوار جمیل"، "شہید پاکستان"، "معاشی بدحالی اور زکوٰۃ" کے علاوہ بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علامہ عبدالستار عاصم

پہلی پُر عجز اور سچی آپ بیتی
''سفر جاری ہے''

سچ اور شفا بخش دوا وقتی طور پر کڑوے ضرور لگتے ہیں مگر ان کی کڑواہٹ کا مزہ چکھنے کے بعد جو راحت اور شفا نصیب ہوتی ہے۔ وہی انسان کی خوش نصیبی ہے۔ اور یہ خوش نصیبی ظاہری اور دنیاوی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتی اس کے اثرات اخروی زندگی پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ قیامت کے بعد جزا و سزا کا فیصلہ بھی اس سچ کی بنیاد پر ہوگا۔ روز محشر انسان کے اعضاء اس کی نیکی و بدی کی گواہی دیں گے۔ زبان کہے گی کہ اس نے فلاں وقت یہ سچ بولا تھا اور فلاں وقت یہ جھوٹ۔ ہاتھ کہیں گے کہ اس نے فلاں وقت ہم سے جھوٹ لکھا تھا اور فلاں وقت سچ۔ ذہن و دماغ گواہی دے گا کہ فلاں بات کرتے وقت اس کی نیت یہ تھی اور فلاں فعل سرانجام دیتے وقت اس کی نیت میں یہ فتور تھا۔ نیتوں کا دارومدار اعمال پر ہے۔ اور نیت صرف اور صرف وہی لافانی طاقت جانتی ہے یا انسان خود۔ انسان دو قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ زندگی کے اعمال و افعال کا حساب کتاب صرف یوم آخر پر ہی ہوگا۔ اس سے پہلے جو کچھ بھی کرتے جائیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ جبکہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کسی وقت بھی نہ سونے اور نہ اونگھنے والی لافانی طاقت جو خالق کائنات بھی ہے ہر وقت انسان کو دیکھ رہی ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی ہوں محفل یا تنہائی

میں۔ دوستوں میں یا غیروں میں۔ بچوں کے پاس یا بڑوں کے روبرو، کھا رہے ہوں یا پی رہے ہوں۔ پڑھ رہے ہوں یا لکھ رہے ہوں اسی ذات لم یزل کو اپنا نگران و حاکم تصور کر کے صرف سچ اور حق کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی کامیاب و کامران ہوں گے اور اس لامتناہی زندگی میں راحت و کامرانی سے زندہ جاوید رہیں گے۔ بقول پروفیسر حسن عسکری کاظمی:

تیرا آغاز نہ انجام کہیں
زندگی تیرا سفر کیسا ہے

اس لامحدود زندگی کی اس طوالت اور ہیشگی کو محسوس کرتے ہوئے مقبول اکیڈمی لاہور کے روح رواں ملک مقبول احمد نے ''سفر جاری ہے'' کے نام سے اپنی خودنوشت شائع کی ہے سفر تو جاری رہے گا۔ مگر مسافر وہی کامیاب و کامران ہوگا جس نے خلوص، عشق اور دیانت کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا ہو ورنہ یہ سفر بھی اکارت جائے گا اور منزل بھی نہیں ملے گی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ملک مقبول احمد نے اپنی خودنوشت میں وہی لکھا جو سچ تھا۔ عظمتِ حرف کی توقیر کا انہوں نے پورا پورا لحاظ رکھا۔ ان کی اس خودنوشت کو پڑھ کر ایک عام پاکستانی شہری، عام طبقہ کے نوجوانوں اور طالب علموں میں ایک بے پایاں حوصلہ اور ہر حال میں زندہ و رواں دواں رہنے کا عزم ملے گا۔

تحریر میں شاعرانہ حسن اور ادیبانہ چاشنی نے اس خودنوشت کو ایک منفرد اور اچھوتی خودنوشت بنا دیا ہے۔ آغاز میں انہوں نے ایک دادا اور نانا ہونے کے ناطے اس فطری حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ کہ دادا کو اپنے پوتوں سے اپنی اولاد سے زیادہ پیار ہوتا ہے اور نانا کو اپنے نواسے نواسیاں اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اپنے پوتے بابر مقبول کے ننھے منے معصوم اور پرتجسس سوالات کو دادا ابو! لائف سیٹ ہے؟ آپ نے کتابیں چھاپنے کا کام کب شروع کیا؟ یہ کام کرنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی

معصوم اور پر جستجو سوالوں کا جواب دینے کے لیے انہوں نے یہ خودنوشت تصنیف کی اور ان اَن کہے سوالوں کا جواب بھی پوری دیانتداری اور فطری حسیات کی روشنی میں دے دیا جو کہ شاید کبھی کوئی بھی نہ پوچھتا اور انہیں جواب نہ دینے کی کوئی سزا بھی نہ ملتی مگر اپنے اندر کے ایک شاعر، ایک برجستہ اور سچ کے متلاشی ملک مقبول کو انہوں نے سچ سچ لکھنے دیا۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

''شادی بیاہ پر خدمت کرنے اور مرگ وغیرہ پر مختلف کاموں کے علاوہ صفیں بچھانے والے بابا خیرو کی لڑکی شمی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ آنے بہانے اس کو دیکھنے کی خاطر اس کے گھر کے قریب سے گزرتا اور وہ مجھے نظر آ ہی جاتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ بھی مجھے دیکھنا پسند کرتی ہے۔ شمی اپنے بچپن ہی میں چند دن نزلہ، کھانسی اور بخار میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ اس کی میت کو سفید کفن میں لپیٹ کر قبرستان میں دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ میں بھی جنازے کے ساتھ گیا میں بچہ تھا لیکن مجھے بڑا دکھ ہوا شمی مجھ سے یکا یک کیوں بچھڑ گئی ہے؟ میں درد کی یہ میٹھی سی آنچ شناخت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی موت کو عرصے تک محسوس کرتا رہا۔ شاید یہی محبت کی آنچ تھی:

میں نے تنہائی میں ہر لحظہ تو سوچا تجھ کو
دل میں حسرت ہے کہ جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو

ملک مقبول احمد اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ ''میرا تعلق اعوان کاشتکار برادری سے ہے۔ میرے گاؤں کا نام دیودال ہے۔ جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے۔ ہمارے گھر میں تین چار گھر پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ گاؤں میں ہمارا خاندان متمول خیال کیا جاتا تھا کیونکہ گاؤں بھر میں صرف ہمارا مکان ہی پانچ کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ بالا منزل پر تھا۔

اسے ہم چوبارہ کہتے تھے۔خاندان کی اراضی وراثت در وراثت نسل در نسل تقسیم ہو جانے کے بعد میرے حصے میں صرف ڈیڑھ یا دو ایکڑ زمین آئی۔"

"یہ بات بھی میرے محسوسات ہی میں شمار ہو گی کہ اپنے گھر کے چوبارے کی چھت پر بیٹھ کر شمال میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹیاں دیکھنا مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔صبح کی چمکتی دھوپ کا عکس ان کو خوب چمکائے رکھتا۔گرمیوں کی صبحوں میں یہ چمک نیلی دھاریاں بن جاتی۔ جو دراصل برف کے پگھلنے کے عمل کا عکس ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک گھٹائیں اُڑ کر آتیں اور سارا منظر ڈھانپ لیتیں اور گھٹاؤں کی سیاہی کے پس منظر میں اڑتے بگلوں کی سفید قطاریں خوب صورت منظر پیش کرتیں۔اب بڑھاپے کی عمر میں سوچتا ہوں کہ بچپن کا زمانہ کتنا خوبصورت زمانہ تھا۔"

ملک مقبول احمد کے بچپن اور جوانی کے حالات و واقعات اور ان کی اپنی سوچ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک شاعر طبع، آئیڈیل ازم کے قائل اور راست گو انسان ہیں مگر دنیا اور بالخصوص موجودہ صدی کا پاکستانی معاشرہ ایک شاعرانہ رویہ اور دانش ورانہ سوچ رکھنے والے انسان کے لیے مشکل اور ٹف ماحول دیتا ہے۔یا شاید دنیا ہر دور میں ایسی ہی رہی ہیں کہ بالکل سیدھے سادھے اور سچے کھرے خیالات رکھنے والے انسان عام معاشرہ میں ان فٹ ہوتے ہیں اس لیے انہیں اپنی عملی زندگی میں بالخصوص شادی کے بعد کے معاملات اور اپنی اولاد کو پالنے پوسنے کے لیے رزق حلال کے حصول میں کڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے ایسے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے جو اس کے ذہن، سوچ اور ذوق کے عین منافی ہوتے ہیں اور اسے اپنی طبیعت کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

معاشرہ میں حلال روزی اور دیانتدارانہ کاروبار کرنے کے محاذ پر جن مشکلات و تکالیف کا سامنا ایک سٹیٹ فارورڈ انسان کو کرنا پڑتا ہے۔وہ تو ملک مقبول احمد جوانی سے

لے کراب تک کر ہی رہے ہیں۔مگران کا گھر واقعی ایک جنت ہے۔ماشاءاللہ۔

دنیا کی بے حسی اسی قدر برداشت کرنا پڑی کہ ایک رات بے گناہ جیل بھی کاٹنا پڑی اپنا آبائی ضلع چھوڑ کر لاہور میں کاروبار شروع کرنا پڑا۔لاہور میں ایک کم وسائل رکھنے والے کاروباری شخص کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا۔اس کے علاوہ ہمارے معاشرہ میں دھوکہ دہی،فراڈ،وعدہ خلافی اوراپنے کم فائدے کے لیے دوسرے کا زیادہ نقصان کرنے والے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ان تمام تلخ حقائق کا ملک مقبول احمد جیسے سادہ لوح شخص کو بے شمار مقامات پر سامنا کرنا پڑا۔مگر وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکرادا کرتے ہیں کہ لوگوں کے بار بار دھوکہ دینے ،نقصان کرنے کے باوجود آج وہ ایک اچھے کاروبار کے مالک ہیں۔میں جس چیز،آسائش یاراحت کی طلب کرتا ہوں خدا کی ذات وہ راحت وآسائش عنایت فرمادیتی ہے۔انہیں حج اور عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ملک مقبول احمد اپنے کاروبار سے اس حوالہ سے بھی بے حد مطمئن ہیں کہ یہ علم پھیلانے والا کاروبار ہے اوراس میں انہیں بین الاقوامی شہرت کے حامل انتہائی نیک خو، ذہین اوراعلیٰ پائے کے مفکرین،ادباءاوردانشور مصنفین سے ملنے،ان سے راہ ورسم بنانے کا موقع ملا۔اپنی اس خودنوشت میں انہوں نے انتہائی پیاراورخلوص سےان کا ذکر بھی کیا ہے۔ ملک مقبول احمد جوتحریراور تصنیف چھاپتے ہیں۔اسے پڑھتے بھی ہیں اورایک حساس دل اور زرخیز ذہن رکھنے کی وجہ سے وہ ان تحریروں سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔اس لیے وہ بعض مصنفین کو ماورائی مخلوق بھی قرار دیتے ہیں۔اور ہر ادیب ومصنف کواس کے قلمی وفکری مرتبے کے مطابق عزت وتکریم بھی دیتے ہیں۔

ایک پبلشنگ ادارے کا مالک ہونے کے ناطے ملک مقبول احمد نے الزامات کا ذکر بھی بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔جوعام طور پر پبلشرز پر لگائے جاتے ہیں۔مثال کے

طور پر:

☆ پبلشرز مصنفین کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

☆ پبلشرز جعلی ایڈیشن چھاپ لیتے ہیں۔ پہلے ایڈیشن پر تعداد صرف پانچ صد چھاپتے ہیں۔

☆ پبلشرز رائلٹی ایک ایڈیشن کی دیتے ہیں لیکن دراصل کئی ایڈیشن چھاپ لیتے ہیں۔

☆ رائلٹی دیتے ہوئے ناشر کی جان نکلتی ہے۔ حالانکہ معاوضہ کوڑیوں میں ہوتا ہے۔

☆ ناشر مصنف پر بہت ظلم ڈھاتا ہے۔

☆ وہ جو رائلٹی طے کرتا ہے وہ بھی یک مشت ادا نہیں کرتا بلکہ قسطوں میں دیتا ہے۔

☆ ناشر کتابوں کی آمدنی سے بلڈنگیں کھڑی کر لیتا ہے جبکہ مصنف کی خستہ حالت ہی رہتی ہے۔

☆ پبلشرز معاہدہ اگر ایک ہزار کتاب چھاپنے کا کرتا ہے تو دس ہزار چھاپ لیتا ہے۔

اس حوالہ سے ملک مقبول احمد نے ایک لطیفہ لکھا ہے جو کہ ایک قسم کا سچ بھی ہے۔

لطیفہ یوں ہے ''کتابوں کے کاروبار سے متعلق تین افراد انتقال کر گئے۔ ایک ادیب تھا۔ دوسرا ناشر اور تیسرا کتابوں کا کباڑیا۔ کسی محکمے نے ان کے ذمے واجبات وصول کرنے کی خاطر ان کے اثاثوں کی تفتیش کی تو ادیب کا اثاثہ سو روپے، پبلشر کا اثاثہ دس ہزار روپے جبکہ کباڑیئے کا اثر حیران کن یعنی ایک لاکھ روپے تھا۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کتابوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور پبلشر اس کاروبار سے کتنا کماتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کوئی بھی ناشر اپنے ہم وطن ادیب کی کوئی بھی کتاب بلا اجازت نہیں چھاپتا کیونکہ اجازت ہی میں اس کی اپنی بچت اور اس کے کاروبار کی مثبت شہرت ہے ورنہ بدنامی۔

ملک مقبول احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ مذہبی بالخصوص سیرت النبی صلی اللہ علیہ

وسلم کے حوالہ سے کتب، رسائل اور دیگر پمفلٹ وغیرہ بلا قیمت تقسیم کرتے ہیں اور تمام تر خرچہ اپنی جیب سے کرتے ہیں۔ حقائق سے ثابت ہے کہ وہ ایک سچے اور کھرے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ وطن عزیز کے علاوہ دنیا کے کئی ادیبوں، شاعروں نے اس پر تبصرے کیے اور ''سفر جاری ہے'' کے بطن سے تین کتابوں نے جنم لیا اور ''راہ نوردِ شوق''، ''پذیرائی'' اور ''شناسائی'' منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ ان کی ''اہل قلم کے خطوط''، ''گم شدہ افسانے''، ''پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم''، ''گلشنِ ادب''، ''سیاحت نامۂ ترکی''، ''ارمغانِ غزل''، ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' ایسی قابل فخر اور زندہ جاوید کتابیں ہیں جن پر اہل وطن کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

ملک مقبول احمد کی خودنوشت پڑھ کر یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی ذات، کردار، اعمال اور لوگوں سے ملنے ملانے کے حوالے سے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھی ہے۔ وہ ایک دیانتدار، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ پاک سے سرشار، انسانیت کا احترام کرنے والے، دکھی انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے۔ اپنی اولاد اور اہل خانہ کی طرح دیگر لوگوں اور دوست واحباب کے بچوں اور اہل خانہ سے محبت اور خلوص رکھنے والے انسان ہیں۔ جذبہ حب الوطنی بھی ان میں بقدر وافر موجود ہیں۔ ان کی خودنوشت پڑھ کر قاری میں ایک پاکیزہ اور جھوٹ سے پاک زندگی گزارنے اور محنت و دیانتداری سے رزق کمانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ خودنوشت ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کی حیثیت کی حامل ہے۔

ملک مقبول احمد کی علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی خدمات تاریخ کا روشن باب ہے۔ انہوں نے زندگی بھر دو ہزار سے زائد کتب شائع کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ لازوال خدمات کے پیشِ نظر پاکستان کی کئی سماجی، ثقافتی تنظیموں نے انہیں اعزازات دینا اپنے

لیے اعزاز سمجھا۔ 2 فروری 2010ء کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں شیخ القرآن، شیخ الحدیث، مفکر عالم اسلام ممتاز مذہبی سکالر مفتی اعظم پاکستان ڈاکٹر غلام سرور قادری سینئر مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان، سابق صوبائی وزیر مذہبی امور کی زیر نگرانی قرآن وامن کانفرنس منعقد ہوئی جو جنگ گروپ کے پلیٹ فارم پر انعقاد پذیر ہوئی اس کانفرنس میں پاکستان بھر سے سینیٹرز، ارکان پارلیمنٹ، قومی لیڈروں نے شرکت کی۔ جن میں قاضی عبدالقدیر خاموش سربراہ PDF، سینیٹر میر محبت خان مری، محترمی سینیٹر ریحانہ یحییٰ بلوچ، محترمہ سینیٹر یاسمین صدیقی، محترمی سینیٹر رتنا بھگوان داس، پاسٹر انور شہزاد، رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ چیئرمین رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن، انجینئر عثمان خان ترکزئی (ایم این اے) صوابی، مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے مرکزی امیر پروفیسر ساجد میر، سہیل وڑائچ (انچارج پروگرام ''جیو کے ساتھ ایک دن'') عزیز احمد اعوان سیکرٹری جنرل تعمیر پاکستان پارٹی، چودھری شہزاد سعید (ایم پی اے د پارلیمانی سیکرٹری) چودھری علی افتخار چیمہ رہنما پاکستان پیپلز پارٹی، میاں محمد ایوب مشیر وزیراعظم پاکستان، حافظ کاشف جمیل مرکزی سیکرٹری اطلاعات مجلس علماء نظامیہ پاکستان، چودھری جمیل اختر چیئرمین گجر فاؤنڈیشن پاکستان، عبدالودود، (عالمی ماہر معاشیات)، مقصود احمد چغتائی (عالمی سیاح)، پروفیسر نذر بھنڈر، محترمہ عذرا سلطانہ چیئرپرسن عظیم آراء فاؤنڈیشن، منوہر چاند (ہندو رہنما)، سردار بشن سنگھ، بشپ ایم ایم وقاص، مفتی وحید قادری (ناظم اعلیٰ) جامعہ رضویہ ٹرسٹ ماڈل ٹاؤن، رانا شہناز احمد خان ایڈووکیٹ، میاں جاوید اقبال (مینجنگ ڈائریکٹر ستارہ کیمیکلز انڈسٹریز) فیصل آباد، شیخ عبدالقیوم صدر چیمبر آف کامرس فیصل آباد، عبدالمجید منہاس چیئرمین حفیظ تائب فاؤنڈیشن، سردار محمد سیف الدین کھوسہ ایم این اے، سردار محمد ارشد خان لغاری ایم این اے، بابر بٹ صدر قومی تاجر اتحاد پنجاب، چودھری جاوید حسن گجر (ایم پی اے) رحیم

یار خاں اور چودھری نوید عالم گجر سابق اولمپین وغیرہ کی موجودگی میں

ملک مقبول احمد کو **لائف اچیومنٹ ایوارڈ** مسلم لیگ کے
مرکزی رہنما سینیٹر میر محبت خان مری نے اپنے دست مبارک سے دیا۔

اس موقع پر انہوں نے ملک صاحب کی مایۂ ناز خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور تمام رہنماؤں نے ملک مقبول احمد کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کی اور درازیٔ عمر کی دُعا دی۔اس کے علاوہ:

قلم فاؤنڈیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے راقم نے بھی ملک مقبول
احمد کو اُن کی ہمیشہ یادر ہنے والی خدمات پر **گولڈ میڈل** دیا۔

انجم بوائے سکاؤٹس کی جانب سے پر عالمی شہرت یافتہ دانشور، ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار:

ڈاکٹر انور سدید نے عظیم آراء فاؤنڈیشن کی طرف سے ملک مقبول
احمد کو **گولڈ میڈل ایوارڈ** دیا۔

ملک مقبول احمد کی 82 سالگرہ کے موقع پر گورے ہوٹل جوہر ٹاؤن میں ان کے اعزاز میں ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں مقصود احمد چغتائی

بانی وچیئرمین عظیم آراء فاؤنڈیشن نے پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کی
جانب سے ڈاکٹر **عبدالقدیر خاں ایوارڈ** دیا۔

اور کہا کہ کیا ہی اچھا ہوا اگر ساری قوم ملک مقبول احمد کی طرح محنت و دیانتداری کو اپنا وطیرہ بنائے تو بہت جلد ہم ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہوسکیں اور اس قومی ہیرو پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ سالگرہ کی اس تقریب میں اکرام اللہ عادل، نفیس قادری روزنامہ جنگ بھی موجود تھے۔راقم نے کہا کہ ملک مقبول احمد کی علمی اور ادبی خدمات کا تذکرہ کیے بغیر عالمی، ادبی تاریخ نامکمل رہے گی۔

سیّد شبیر حسین شاہ زاہد

سید شبیر حسین شاہ زاہد کا پیشہ تعلیم و تدریس ہے لیکن ادب سے محبت کی نموان کے داخل سے ہوئی اور یہ خود بخود پروان چڑھتی رہی، اور اب یہ تن آور درخت بن چکی ہے۔ آپ ان کی بارہ مطبوعہ کتابوں کو اس درخت کی شاخیں اور ان کے پچاس سے زائد مطبوعہ مقالات کو اس درخت کے پتے شمار کر سکتے ہیں۔

شبیر حسین زاہد سکھوں کے مشہور مقام ننکانہ صاحب میں 5 مارچ 1958ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک 1975 میں سائنس گروپ میں کیا۔ لیکن پھر ادب کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور 1998ء تک اسلامیات، تاریخ اور عربی میں پنجاب یونیورسٹی سے تین ایم۔اے کر لیے۔ پاکستان نیوی میں ملازمت کے دوران اسلام آباد میں لائبریری اور تحقیقی اکیڈمی قائم کی۔ محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرار مقرر ہوئے تو ننکانہ صاحب میں گوشۂ محققین قائم کیا اور لائبریری بنائی۔ ان کے دینی مقالات پر حکومت پاکستان کی وزارتِ مذہبی امور تین مرتبہ انعام دے چکی ہے۔ اسلام آباد میں قیام کے دوران انہوں نے پاک فوج کے رسالہ ''ہلال'' میں اور ماہنامہ ''نیوی نیوز'' میں معاون مدیر کی خدمات انجام دیں۔ ننکانہ کالج کے رسالہ ''مضراب'' کی ادارت میں ان کی معاونت گراں قدر شمار کی جاتی ہے۔

پروفیسر شبیر حسین زاہد اردو ادب کے شیدائی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مقبول اکیڈمی کی بیشتر مطبوعات ان کی لائبریری میں موجود ہیں، جن سے سینکڑوں تشنگانِ علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' انہوں نے اپنی لائبریری کے لیے حاصل کی تھی۔ مطالعے کے بعد اس پر از خود تبصرہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے گراں قدر خیالات کا عکس ان کے مضمون میں موجود ہے۔ راقم مقبول احمد ان کے اس مضمون کے لیے شکر گزار ہے۔

پروفیسر سیّد شبیر حسین شاہ زاہد

گوشۂ محققین ننکانہ صاحب

لاہور کے مشہور و معروف اشاعتی ادارے مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار کے مالک، بانی، منتظم جناب ملک مقبول احمد صاحب کی خود نوشت سوانح ''سفر جاری ہے'' اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر ہے۔ 455 صفحات کی اس کتاب میں ملک صاحب نے اپنے بارے میں وہ سب واقعات، تجربات، جگ بیتی و ہڈ بیتی، خاندانی کوائف و مرحلہ وار ترقی کے تمام کوائف جمع کر دیئے ہیں جو کسی بھی سوانح یا خود نوشت سوانح میں ہونے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ شاید یہ کتاب میرے ہاتھ نہ آتی اگر میرے محترم جناب شبیر احمد خان میواتی صاحب مجھے ملک صاحب سے متعارف نہ کرواتے اور ملک صاحب کی ''سفر جاری ہے'' میرے خریطہ علمی میں ڈالنے کی سفارش نہ کرتے۔

کتاب کی ہارڈ کور کی جلد کو پلٹیں تو ایک خوبصورت، سادہ، سبز رنگ کے صفحہ کو آنکھوں کی تریاوٹ کو تازہ کرنے کے لئے خالی رکھا گیا ہے اس سے اگلے صفحہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے طغرہ کے نیچے یہ دعا رقم کی گئی ہے۔

''صرف اللہ ہی ہے جس سے مدد چاہی جائے اور اللہ ہی کے کرم پر موقوف ہے مقاصد اور مرادوں تک پہنچنا اور کسی مقصد کے لئے سعی و حرکت اور اس کو

حاصل کرنے کی قوت وطاقت صرف اللہ ہی سے مل سکتی ہے۔"

"سفر جاری ہے" کے اندرونی سادہ ٹائٹل سے اگلے صفحہ پر انتساب ہے جو فاضل قلمکار نے اپنی "بے جی" کے نام اور اپنے "ابا جی" کے نام کیا ہے۔ شہرہ آفاق فلسفی ژاں ژاک روسو کی آپ بیتی "اعترافات" ترجمہ امجد علی بھٹی کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے جس کی چند سطریں نیچے درج کی جاتی ہیں۔

"میں نے ہر وہ بات جو کہ قابل تعریف یا قابل اعتراض تھی پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے نہ میں نے کوئی جرم چھپایا ہے اور نہ ہی میں نے اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا ہے۔۔۔۔ میں جیسا تھا خود کو دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا ہے کبھی حقیر، ذلیل اور کبھی بہت نیک، فیاض اور ان سے بھی برتر، اگرچہ لافانی طاقت (یعنی خدا تعالیٰ) میرے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے۔"

پیش لفظ ملک مقبول احمد کے قلم سے نکلا ہے اس کے بعد بارہ (۱۲) معروف اور مستند اہل قلم کی آراء / تاثرات / تحسینات ہیں جو انہوں نے ملک صاحب کے بارے میں اپنے دل سے ڈھونڈھ کر رقم کر دی ہیں ان معروف اصحاب کی تحریروں کے عنوانات ان کے اسماء گرامی کے ساتھ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

☆ایک ادبی دستاویز	ڈاکٹر صفدر محمود	☆ایک دلچسپ خودنوشت	علی سفیان آفاقی
☆عرضِ سدید	ڈاکٹر انور سدید	☆سادگی و پرکاری	ڈاکٹر طارق عزیز
☆ایک رومان پرور ادیب	اے حمید	☆شعیب نامہ	شعیب بن عزیز
☆ایک معتبر ادارہ	طارق اسماعیل ساگر	☆تقریظ	سید واجد رضوی
☆ایک مقبول بارگاہ شخصیت	ابوالامتیاز ع۔س مسلم	☆ادب کی شمع فروزاں	قاضی ذوالفقار احمد
☆خلوص کا روشن چراغ	قمر نقوی	☆ایک تاثر	ڈاکٹر اللہ بخش ملک

کتاب اوراس کا تعارف بھی ملک مقبول احمد صاحب نے خود کروایا ہے اس کے بعد چودہ ابواب میں ملک صاحب نے اپنی زندگی کے دریچے کھول کر رکھ دیئے ہیں اور یہی اصل ہے اس کتاب کا، ملک صاحب کی خاندانی، ذاتی، ازدواجی، تعلیمی زندگی، اس زندگی میں نشیب بھی آئے اور فراز بھی، سکھ بھی آئے اور دکھ بھی، پریشانیاں بھی آئیں اور راحتیں بھی، سفارشیں بھی آئیں اور تلخیاں بھی، رکاوٹیں بھی آئیں اور آسانیاں بھی، کاروبارزندگی کے اونچ نیچ اورروزگار کمانے کے مراحل بھی آتے رہے پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سفر سعادت (حج کا سفر) بھی نصیب ہوااوردربار نبی ﷺ میں حاضری کی عزت بھی ہاتھ آئی۔ ''چند حادثے زندگی کے'' چار حادثوں، ڈاکہ اور پیپرمل لگانے میں ناکامی کا ذکر کیا گیا ہے۔ــــــــ چند ''مصنفین کا تذکرہ'' کے عنوان سے ملک صاحب نے چالیس (40) شخصیات کا تعارف مع ان کی تصویروں کے کروایا ہے اور چھ شخصیات کا تعارف بغیر تصویر کے کروایا ہے۔ ــــــــ مقبول اکیڈمی کی چند خواتین علمی معاونین میں چھ خواتین کا تعارف بمعہ تصویروں کے اور دو خواتین کا تعارف بغیر تصویروں کے دیا ہے۔ ــــــــ دیگر مصنفین اور مترجمین کے ذیل میں بیس جیداور معروف اہل قلم کے نام گنوائے ہیں۔

اپنے مضمون ''وکھری ٹائپ کے لوگ'' میں ملک مقبول احمد صاحب نے چند ایسے افراداورواقعات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ملک صاحب کوحیران کردیا نتیجتاً ملک صاحب ان کا ذکر اپنی خودنوشت میں محفوظ کرنے پر مجبور ہو گئے مگر یہ حق ہے کہ ان میں سے جن حضرات نے ملک صاحب سے برائی کی ان کا نام لئے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔اور جنہوں نے ملک صاحب سے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے ان کا نام لے کر ان کے سلوک اور کام کو سراہا گیا ہے۔ (1) طویلے کی بلا بندر کے سر (2) ایک مدیراورادیب (3) گمنام فحش نگار ڈبلیو ڈبلیو (4) ایک مشہور کالم نگار (5) ایک اور نامور سکالر (6) ایک معزز

ناول نگار (7) انوکھی ناراضی (8) ایک معروف ادیب (9) میری کتب فروش برادری کا ایک بندہ (10) ایک شاعر کا کردار (11) ایک پروفیسر ادیب میں ایسے ہی عجیب واقعات، حادثات، محسوسات اور رویوں کا ذکر ہے۔

''تندرستی ہزار نعمت ہے'' میں ملک صاحب نے اپنی صحت اور بیماریوں کے حوالے سے ایک تاریخ مرتب کی ہے اسی حوالے سے لوئی کو ہنی کی کتاب ''علاج بذریعہ پانی'' کی افادیت کو عام کیا ہے۔

انٹرویوز کے سلسلہ میں ہفت روزہ فیملی سے انٹرویو میں ملک صاحب کی گفتگو کے ان فقروں کو ''مولڈ'' کیا گیا ہے۔

کتابیں چھپتی زیادہ ہیں بکتی کم ہیں۔

لوگوں میں مطالعہ کا ذوق نہیں رہا۔

جو لوگ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں ان کی جیب اجازت نہیں دیتی۔

لائبریریوں میں کتابوں کے لئے بجٹ نہیں ہوتا ایک لائبریری جہاں پندرہ برس میں پانچ کتابیں آئیں۔

سفرنامے سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

ایک لائبریری جس کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔

محکمہ تعلیم کے پاس بجٹ کم ہے کتابوں کا بوجھ ہے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور میں انٹرویو کے دوران ملک مقبول احمد صاحب، صاحبانِ اقتدار کو یہ تجاویز کرتے ہیں۔

غیر معیاری کتابیں چھاپنے والوں کے خلاف حکومتی سطح پر کارروائی ہونی چاہیے۔

اخلاق باختہ اور غیر معیاری کتابیں چھاپنے والوں کے خلاف حکومتی سطح پر

کارروائی کی جانی چاہیے۔

''مقبول اکیڈمی'' نے ابوالکلام آزاد کی ''آزادی ہند'' شائع کی اور ''رن کچھ سے چونڈہ تک'' نامی کتاب بھی شائع کی تو ایک پر ادبا نے اور دوسری پر اعلیٰ حکام نے ملک صاحب کو خطوط ارسال کیے کسی میں محض کتاب کی وصولی کی رسید اور شکریہ ہے اور کسی میں خیال آرائی اور گفتگوئے مزید پائی جاتی ہے۔ ان بارہ خطوط کی خوبی یہ ہے کہ جیسے اور جس تحریر میں حضرات مکتوب نویسوں نے لکھا ملک صاحب نے بعینہٖ شائع کر دیئے خط بھی پڑھیے قسم قسم کی تحریروں کا لطف بھی اٹھایئے اور اکابر کے دستخط کے نمونے (آٹوگراف) بھی محفوظ کیجئے۔ سرکاری خطوط Typed حالت میں ہیں۔

''چند ادیبوں کے خطوط'' میں مرزا ادیب کے خطوط سب سے زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں سید رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، اے حمید، مولانا حامد علی خان، مرزا ادیب، مشفق خواجہ، ڈاکٹر انور سدید، ادا جعفری، حمید کاشمیری، محشر بدایونی، سید قاسم محمود، محمد سعید، ڈاکٹر وحید قریشی، سید ضمیر جعفری، سید واجد رضوی، ستار طاہر، عذرا اصغر، اختر جمال، قمر نقوی (طویل بحر کی نظم کے ساتھ)، ابوالامتیاز ع۔ س مسلم، احسان الحق سلیمانی، کلیم اختر، رضیہ فصیح احمد، غلام الثقلین نقوی، ناصر زیدی، جاوید امتیازی، ثاقب رزمی، اظہر جاوید، خاور اعجاز، ڈاکٹر رشید امجد، ام عمارہ، علی سفیان آفاقی، تاج سعید، اور ایم اے راحت ملک مقبول احمد کو مکاتیب محبت والفت لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

''مقبول اکیڈمی کی مطبوعہ کتابوں پر چند تبصرے اور کالم'' کے عنوان سے بتیس کتابوں پر اخباری تبصرے شامل کیے گئے ہیں جو بڑی نامور اور قد آور شخصیات کے قلم سے نکلے ہیں۔ اگرچہ اخبارات میں تبصروں میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تاہم جامعیت واختصار کو ان تبصروں میں بڑی مہارت سے جمع کیا گیا

کتاب ''سفر جاری ہے'' کے بیک ٹائٹل پر ملک مقبول احمد صاحب کی خوبصورت پاسپورٹ سائز تصویر ہے جس کے ساتھ شخصیات کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فاضل مؤلف نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر سچی سچی اور کھری کھری باتیں کر دی ہیں سنتے تھے کہ پبلشرز بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ صفحہ 220 پر ''ناشرین اور الزامات'' کے تحت ایسے ہی اعتراضات نقل بھی کئے گئے ہیں مگر ''سفر جاری ہے'' پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ پبلشر بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ وہ چکر کھاتے ہیں چکر کھاتے رہتے ہیں اور ہوشیار قسم کے قلمکار ان کو بدھو بناتے رہتے ہیں۔ کاش کہ میرا بھی کسی ایسے پبلشر سے واہ پڑا ہوتا۔ شاید ابھی یہ تبصرہ لکھنے کے بعد واہ پڑ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقت نے ملک صاحب کو بھی ہوشیار کر دیا ہو۔ بہر حال ملک صاحب کا ''سفر جاری ہے'' قابل مبارک کام ہے۔ جو سبق آموز بھی ہے محنتی لوگوں کے لیے رہنما بھی ہے اور متوکل علی اللہ لوگوں کے ایمان کا اضافہ بھی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔۔۔



شفیع ہمدم

شفیع ہمدم نے اپنی اَدبی زندگی کا بیشتر حصہ ہیر کی نگری جھنگ میں گزارا ہے۔ انہیں اس سرزمین میں محبت کی خوشبوئیں مہکانے اور اس دھرتی کے انسانوں میں بے دریغ بانٹنے کا شرف حاصل ہے جو نسل در نسل آگے بڑھ رہا ہے۔ مجید امجد، شیر افضل جعفری، جعفر طاہر، محمد حیات خان سیال، اور عبدالعزیز خالد کے فن کو جھنگ نے ہی پروان چڑھایا تھا۔ اور اب ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، عبداللہ عامر اور حنیف باوا کے ساتھ شفیع ہمدم بھی اُردو ادب کے وسیع سمندر میں اپنی لہریں منفرد انداز میں پیدا کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایم اے ایم فل تک تعلیم حاصل کی...... گوَرنمنٹ کالج جھنگ میں تعلیمی خدمات سرانجام دیں اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔

شفیع ہمدم جامع الحیثیات ادیب ہیں، وہ شاعر ہیں' افسانے لکھتے ہیں' انشائیے تخلیق کرتے ہیں، اور اپنے مطالعات کا ثمر تنقید میں بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک شفیع ہمدم کی ذات تو ہے ہی لیکن اہم بات ان کا زندگی پر ایک ایسے انسان کی نظر ڈالنا ہے، جسے اللہ نے نفسِ مطمئنہ سے نواز رکھا ہے۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں، تین اُردو میں (دل داستاں سلامت، اور حال احوال (خاکے)، ''رعنائی خیال'' (انشائیے) اور دو پنجابی میں (چانن اور تصویر گواچ گئی (افسانے) ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں ایوارڈ یافتہ ہیں جس کا اظہار شفیع ہمدم نہیں کرتے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''کتابوں کی کہکشاں'' افسانوں کا مجموعہ ''آواز کا پھندہ'' خاکوں کی کتاب ''ذکراذکار'' اور انشائیوں کا مجموعہ تبسم ہائے پنہاں'' زیرترتیب ہیں۔

شفیع ہمدم کے فن پر ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر ناصر عباس منیر مضامین لکھ کر ان کے فن کا اعتراف کر چکے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج جھنگ سے ریٹائر ہونے کے بعد اب فیصل آباد میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے ہیں اور ہمہ تن اَدب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

مجھے ان سے تاحال غائبانہ تعارف حاصل ہے۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ دیر سے موصول ہوا، لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ''دیر آید درست آید''۔

شفیع ہمدم



سفر جاری ہے۔ ایک خودنوشت

آپ بیتی کی عمارت عہد رفتہ کی یادوں کی اینٹوں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ اینٹیں کھردری اور رف بھی ہوتی ہیں۔ خوبصورت اور شفاف بھی۔ ایک خودنوشت دونوں قسم کی اینٹوں کو اپنی آپ بیتی کی عمارت میں اتنی عمدگی سے لگاتا ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے خودنوشت کے گزرے ہوئے۔ تلخ و شیریں حالات دیکھ رہا ہو۔ ماضی کے بند دراور دریچے کھول کر یادوں کے جگنوؤں کو رقص کناں دیکھنا ہر ذی شعور شخص کا من پسند مشغلہ ہوتا ہے مگر ایک آپ بیتی نگار اپنے بیتے ہوئے دنوں کو آواز دیتے ہوئے دوسروں کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ یہ خودنوشت کا کمال ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کو اتنی خوبصورتی سے صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس میں اپنی دلچسپی کا سامان مل جاتا ہے۔

سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کی سرحدیں اس قدر قریب ہوتی ہیں کہ اگر خاکہ نگار احتیاط سے کام نہ لے تو خاکہ لاشعوری طور پر سوانح نگاری کی مملکت میں داخل ہو جاتا ہے۔ خاکہ نگار کا کام سوانحی حالات بیان کرنا نہیں بلکہ افکار و کردار کی مدد سے موضوع خاکہ کو بحیثیت انسان نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ ایک خودنوشت اپنی آپ بیتی میں پیدائش سے

دور حاضر تک کے تمام حالات، واقعات اور حادثات کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ جبکہ خاکہ نگار حالات، واقعات اور حادثات کے اس ڈھیر میں سے صرف ان واقعات اور حادثات کا انتخاب کرتا ہے جس سے شخصیت کی سیرت واضح ہو سکے اور اس پر کسی اور کی شخصیت کا اثر نہ ہو سکے۔ خاکہ اپنا بھی تحریر کیا جا سکتا ہے اور دوسروں کا بھی لکھا جا سکتا ہے۔ مگر آپ بیتی میں مصنف اپنی نجی زندگی کو زیر بحث لاتا ہے اور اسے ویسے ہی پیش کرتا ہے جیسی کہ وہ ہے۔ وہ نہ تو کچھ چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی فرضی واقعات کے ذریعے اسے رنگین اور دلچسپ بنانے کی سعی کرتا ہے۔

ملک مقبول احمد ایک نامور، تجربہ کار، کامیاب اور بہت پرانے پبلشرز ہیں۔ ان کے ادارے مقبول اکیڈمی نے ملک کے بہت سے جید مصنفین کی کتابیں شائع کی ہیں۔ بے شمار مصنفین کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات ہیں اور ان میں سے بعض ان کے بہترین دوست بھی ہیں۔ سفر جاری ہے ان کی خودنوشت ہے جس میں چند مصنفین کا تذکرہ اور تصاویر بھی موجود ہیں۔ جن میں احسان دانش، رئیس احمد جعفری، مرزا ادیب، اے حمید، ڈاکٹر انور سدید، حفیظ تائب، طارق اسماعیل ساگر، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر وحید قریشی، مولانا حامد علی خان، عبدالعزیز خالد، اظہر جاوید، ساغر صدیقی، غلام الثقلین نقوی اور ایم اسلم کے نام بہت نمایاں ہیں۔ خواتین میں بلقیس ریاض، ثریا خورشید، ادا جعفری، سلمٰی اعوان، عذرا اصغر، رضیہ فصیح احمد اور نشاط فاطمہ قابل ذکر ہیں۔

ان نامور مصنفین اور ان کی کتب کے درمیان اپنی عمر عزیز کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود ان کے دل میں کبھی خود لکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ان کے اندر کے ادیب کو جو نجانے کب سے ان کے بھیتر چھپا بیٹھا تھا۔ اس کا کھوج لگانے، باہر لانے اور لکھنے پر آمادہ کرنے کا کام ان کے پوتے، پوتیوں نے انجام دیا۔ ان کے چند ادیب دوستوں نے بھی انہیں اپنی آپ بیتی لکھنے پر آمادہ کیا۔ بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے

اپنے اندر کے ادیب کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ادیب دوستوں اور پوتے پوتیوں کی نشان دہی پر انہوں نے اپنے اندر کے ادیب کی طرف توجہ دی تو ''سفر جاری ہے'' جیسی معیاری، آسان اور خوبصورت آپ بیتی صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگی۔

علی سفیان آفاقی سفر جاری ہے پر ایک دلچسپ خودنوشت کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

> ''اس خودنوشت کا ہر صفحہ ملک صاحب کے شوق جستجو، محنت ولگن اور سادگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔انہوں نے اپنی شخصیت کا کوئی بھی پہلو چھپا کر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت کے خاتمے پر قاری اپنے تجربے اور مشاہدے میں بہت کچھ اضافہ کر کے کتاب بند کرتا ہے۔انہوں نے زندگی کے اہم واقعات اور زندگی میں داخل ہونے والی شخصیات کا تفصیلی خاکہ پیش کر دیا ہے۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک محنتی، ان تھک، خداترس اور انسان دوست شخص کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔''

ملک صاحب نے اپنی آپ بیتی میں بچپن سے لے کر دور موجود تک کے تمام حالات وواقعات کو سادہ مگر پرکشش الفاظ میں اتنی روانی سے بیان کیا ہے کہ مطالعہ کے دوران قاری کو کسی مقام پر بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔وہ نہایت انہماک سے آپ بیتی کا مطالعہ کرتا اور لطف اٹھاتا ہے اور ایک محنتی، ایماندار، صابر، پرخلوص اور نیک نیت انسان کی زندگی کے گوناگوں تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کرتا ہے۔ملک صاحب اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے افراط وتفریط کا شکار نہیں ہوئے۔انہوں نے اپنی خودنوشت میں خود کو ویسا ہی دکھایا ہے جیسا کہ وہ ہیں۔اپنی غربت اور تنگ دستی کا ذکر بھی وضاحت سے کیا حتیٰ کہ اپنی بیوی کے زیورات کو فروخت کرنے کو بھی صرف نظر نہیں کیا۔اپنے رشتہ داروں کو بھی ویسا ہی دکھایا ہے جیسا کہ

وہ ہیں۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ معاشرے میں جب کسی اہم مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو غریب رشتہ داروں کو اپنی قلمرو سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اگر خونی رشتوں کا ذکر ناگزیر ہو جائے تو ان پر ملمع چڑھا کر پیش کرتے ہیں مگر ملک صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی ویسی ہی تصاویر پینٹ کی ہیں جیسی کہ ہیں۔ تصاویر پینٹ کرتے وقت اوریجنل رنگ استعمال کیے ہیں۔ مانگے تانگے کے شوخ و شنگ رنگ استعمال کر کے ان کے اصل خدوخال چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو خفیہ رکھنے کی سعی بھی نہیں کی اور نہ ہی اپنی پسند کی عینک لگا کر انہیں دیکھا اور دکھایا ہے۔ انہوں نے نہایت سادگی سے اپنی آپ بیتی میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ تمام خوبصورت لڑکیاں انہیں بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتے تھے۔ سفر جاری ہے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہو گی کہ ''میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔'' میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔ خوبصورت، دلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی تھی۔

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا''

بابا خیرو کی بیٹی شمی کا دل کو اچھا لگنا اور ہر وقت اس خوبصورت لڑکی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رہنے کی خواہش کرنا۔ اسے دیکھنے کے لیے بلا جواز اس کے گھر کے سامنے سے گزرنا، بدقسمتی سے اس حسین لڑکی کا بچپن ہی میں انتقال ہو جانا۔ ملک صاحب کا بوجھل قدموں اور پرنم آنکھوں سے اس کے جنازے میں شامل ہونا۔ اسے منوں مٹی کے نیچے دفن ہوتے دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اور ایک عرصے تک اس کی جدائی میں بے چین رہنا ایک فطری عمل ہے۔ بعدازاں وہ اپنے گھر کی کھوئی سے پانی بھرنے والی

دو سگی بہنوں شہناز اور شمشاد سے متاثر ہوئے اور اپنے دل میں ان کی محبت کے چراغ روشن کیے مگر شہناز نے بچپن ہی میں بار زیست اتار پھینکا اور شمشاد سے محبت کا کھیل جاری رہا۔ قول و قرار ہوئے مگر بدقسمتی سے یہ محبت بھی پروان نہ چڑھ سکی اور اس کے والدین نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی دوسرے گاؤں میں کر دی تو یہ طوفانی اور افلاطونی محبت بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

ملک مقبول احمد کو اپنے گاؤں دیووال (جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے) سے والہانہ محبت ہے۔ انہوں نے اپنے گاؤں کی طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کی عکاسی اتنے میٹھے اور دلنشین انداز میں کی ہے کہ قاری اس کی چاشنی سے چپک کر رہ جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ وہاں کے ساون، میلوں ٹھیلوں، ناٹکوں، کچے پکے گھروں، گلیوں کوچوں، جوہڑوں، ندی نالوں، کھیتوں کھلیانوں، کنوئیں سے پانی بھرتی پنہاریوں، وہاں کے سادہ اور پرخلوص لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی میں اپنے بچپن کے چند دوستوں اور گاؤں کے چند انوکھے کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے دوستوں میں میر خلیل احمد اور گیان چند کو اب بھی یاد کرتے ہیں۔ گیان چند ان کے کلاس فیلو تھے اور دونوں اکٹھے سکول سے بھاگا کرتے تھے۔ بیری کے تنوں پر بیٹھ کر گپیں لگانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ گاؤں کے کرداروں میں ماسٹر فیروز دین، چودھری مولا داد، میاں اللہ ماہی اور چودھری دسوندھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر فیروز دین ایک ایسے استاد تھے جو بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ اکثر کرداروں کے نام اپنے اندر دیہی ثقافت کی خوبو لیے ہوئے ہیں۔ ان کرداروں میں ایک کردار اللہ ماہی کا ہے۔ وہ ایک غیر شادی شدہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی دکان سکول کے راستے میں تھی۔ چھٹی سے پانچ منٹ پہلے وہ اپنی دکان بند کر دیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے سکول سے جاتے ہوئے

بچے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ تاہم بعد میں اس کی شادی ہوگئی اور اب اس کے بچے بھی جوان ہو گئے ہیں۔ چودھری دسوندھی خان گاؤں کا ایک جاندار کردار ہے۔ وہ معروف گاؤں ورک کے ذیلدار تھے۔ بڑے سخی، ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ گاؤں کے لوگوں پر بہت مہربان تھے۔ ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے تھے۔ لوگوں کے مسائل حل کر کے انہیں دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ لوگ ان کے خوف سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے تھے۔ ملک صاحب کی بھی انہوں نے بڑی معاونت کی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی سوانح میں چودھری دسوندھی کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے اور انہیں اپنا محسن قرار دیا ہے۔

شبستان شباب میں قدم رکھتے ہی ملک صاحب اپنی ماموں زاد نظیر بیگم سے ازدواجی بندھن میں بندھ گئے مگر یہ شادی زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ نظیر بیگم ان کی والدہ سے جو اُن کی پھوپھی بھی تھیں بدتمیزی سے پیش آنے لگی۔ وہ ضد کی پکی اور ذہن کی کچی خاتون تھی۔ ملک صاحب کے متعدد بار سمجھانے بجھانے اور دھمکانے کے باوجود اپنی حرکت سے باز نہ آئی اور بالآخر روٹھ کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ کافی عرصہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ ملک صاحب کی دوسری شادی نہایت سادگی اور خاموشی سے ہوئی۔ ان کی دوسری شریک حیات خورشید نے اپنے حسن سلوک سے سب گھر والوں کے دل جیت لیے اور ان کی والدہ کی ایسی خدمت اور تابع فرمانی کی کہ جس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے وہ نہایت نفیس اور سلیقہ شعار خاتون ہے۔ صفائی ستھرائی کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ہر وقت آئینے کی طرح گھر کو چمکائے رکھتی ہیں۔ خورشید بیگم نے اس سلیقے سے گھر سنبھالا کہ ملک صاحب کو گھر کی طرف سے بالکل بے فکری ہو گئی اور وہ اقبال کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

ملک صاحب نے جب پاکستان کے دل لاہور میں قدم رکھا تو جے وی کی سند، تھوڑا سا سرمایہ زمانے کے تھپڑوں کے علاوہ اقبال کی شاعری سے حاصل کیا ہوا یقیں محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا جذبہ ان کے پاس تھا۔ شاہ عالم مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرایے پر حاصل کر کے اس کے ایک کمرے میں میگزین چودھویں صدی کا دفتر بنایا اور ساتھ ہی پبلشنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔ پبلشنگ میں تو فی الحال کامیابی حاصل نہ ہوئی البتہ میگزین کی باقاعدہ اشاعت کا ڈیکلریشن مل گیا۔ احسان دانش اس میگزین میں بطور نگران شامل تھے۔ انہیں پبلشر بن جانے کے اس سفر میں آلام وادبار، تہی دامنی اور بے زری کا قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔ وہ بدنصیبی اور عسرت کے تمام وار مکرم اقبال کی ڈھال پر روکتے اور قدم قدم چلتے رہے اور بالآخر پبلشنگ کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔

ملک مقبول احمد کے دل میں لاہور کا نامور پبلشر بننے کی شدید خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوہ نور چیمبر میں دفتر اور رہائش کے لیے کرایے پر ایک فلیٹ حاصل کیا۔ PIBC کے نام سے پرنٹنگ پریس قائم کیا مگر یہ کاروبار نہ چل سکا اور اپنے والد صاحب کی عمر بھر کی کمائی بارہ ہزار روپے تجربات کی نذر کر دیئے۔ اس زمانے میں بارہ ہزار کی رقم ہاتھی کے وزن کے برابر ہوتی تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس خسارے سے سنبھلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ وہ طباعت سے تائب ہو کر اپنے گاؤں چلا جاتا اور زراعت کی طرف توجہ دیتا۔ سچ ہے کہ ہاتھی کا وزن ہاتھی ہی اٹھاتا ہے۔ اس ناکامی سے ناامید ہونے کی بجائے ان کے جوش جنون میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کی بلند حوصلگی، صبر و استقامت اور جہد مسلسل کو دیکھتے ہوئے بالآخر کامیابی نے انہیں اپنے گلے سے لگا لیا۔

جب پبلشنگ کا کاروبار چل نکلا تو ان کے حاسدین بھی پیدا ہو گئے۔ جو اپنی تمام تر صلاحتیں اور قوت انہیں نقصان پہنچانے اور ان کی شہرت کو داغدار کرنے میں صرف کرنے لگے۔ اپنے ایک کارکن کی ملک صاحب نے بد دیانتی پکڑ لی۔ اسے غلطی کا احساس دلاتے ہوئے تسلیم کرنے کو کہا تو اس نے اپنی غلطی ماننے سے انکار کر دیا تو اسے فارغ کر دیا گیا۔ اس شخص نے بدلہ لینے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے اور ان پر بے بنیاد الزام لگائے مگر سچ کے سامنے جھوٹ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا۔

1961ء میں سرگودھا کے انسپکٹر آف سکولز نے لائبریری کتب کی فراہمی کا ٹینڈر بذریعہ اخبارات طلب کیے تو مقبول اکیڈمی کا ٹنڈر منظور ہو گیا اور بروقت آرڈر کی تکمیل کر دی گئی تو مقبول اکیڈمی کی اس عظیم کامیابی پر حاسدین کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی اور وہ مقبول اکیڈمی کے خلاف خوب نمک مرچ لگا کر اخبارات میں جھوٹی خبریں چھپوانے لگے۔ علاوہ ازیں حاسد ناشرین کی ایک میٹنگ کے بعد اس اکیڈمی کے خلاف ایک درخواست افسر اعلیٰ کو گزاری گئی۔ چنانچہ کیس انسداد رشوت ستانی کو تحقیق کے لیے بھجوا دیا گیا اور محکمانہ تحقیقات کے نتیجے میں ڈویژن کے انسپکٹر سکولز سمیت کئی افراد معطل کر دیئے گئے۔ ملک صاحب نے اپنے محسن چودھری دسوندھی کے ہونہار فرزند ظفر اقبال ورک کو اپنا وکیل مقرر کیا اور چند پیشیوں کے بعد ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد فیصلہ مقبول اکیڈمی کے حق میں ہو گیا اور سرگودھا کے تمام افسران کو بحال کر دیا گیا۔ مقبول اکیڈمی ایک ایسی تند و تیز آندھی ثابت ہوئی جس نے مخالف حاسدین کے اتحاد کا شیرازہ ریت کے ذروں کی طرح بکھیر دیا۔

ملک مقبول احمد ایک عرصہ تک اس کاروبار کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ جب انہیں اس کاروبار کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہی ہو گئی تو کافی غور و فکر کے بعد مقبول اکیڈمی قائم کر کے پبلشنگ کی شاہراہ پر قدم رکھا تو رفتار میں

تیزی آنا قدرتی بات تھی۔ اس کے بعد اس ادارے سے ایسی کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو نفع کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دل و دماغ کو بھی روشن کرسکیں۔ اس ضمن میں رئیس احمد جعفری نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور پہلی قسط میں انہیں اپنے دو ناولوں کے مسودے عنایت کیے۔ جس سے ان کا حوصلہ بلند ہوا۔ انہوں نے دونوں ناول بہت کم مدت میں خوبصورت انداز میں شائع کیے ان کی قیمت بھی بہت کم رکھی۔ چنانچہ وہ بہت کم عرصے میں فروخت ہو گئے۔ ان دنوں رئیس احمد جعفری کے ناولوں کی بڑی مانگ تھی۔ ان ناولوں کی مقبولیت اور فوری فروخت سے مقبول اکیڈمی کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ بعد ازاں ملک صاحب کی گزارش پر جعفری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت India wins Freedom کا ترجمہ آزادئ ہند کے عنوان سے کیا۔ اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو گئے اور اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

احسان دانش کے پاس ایک نایاب کتاب ''تمدن عرب'' تھی۔ جسے فرانس کے نامور ادیب گستاؤلی بان نے تحریر کیا تھا۔ کتاب کافی ضخیم اور باتصویر تھی۔ جس کا ترجمہ سید علی بلگرامی نے کیا تھا۔ ملک صاحب نے کتاب پانچ سو روپے میں خرید لی۔ اس کی اشاعت کے اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ تھا اور ان کے پاس اس وقت اتنی رقم موجود نہ تھی۔ انہوں نے پہلے اپنے ماموں خسر سے رقم ادھار حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی پھر دوسرے ماموں سے درخواست کی تو انہوں نے تھوڑی سی رقم عنایت کر دی مگر کتاب کی اشاعت پر جو رقم خرچ آنا تھی اس کی وہ عشر عشیر بھی نہ تھی۔

ملک صاحب ہر طرف سے مایوسی کے اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے۔ لاکھ ذہن کے گھوڑے دوڑائے مگر کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اچانک ان کے ذہن میں جھماکا ہوا اور اپنے ایک قلمی دوست ملک اللہ داد صاحب جن سے

بالمشافہ کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ان کا خیالی چہرہ ملک صاحب کے ذہن کی سکرین پر مسکرانے لگا۔ چنانچہ وہ ملک اللہ داد خان کے گاؤں سلطان خیل میانوالی گئے۔ خاطر مدارات کے بعد اللہ داد خان نے ان کی اچانک آمد کے بارے میں دریافت کیا تو ملک صاحب نے مناسب الفاظ میں اپنی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔اللہ داد خان صاحب نے پانچ ہزار کی رقم واپسی کا وعدہ لیے بغیر ان کے حوالے کر دی اور اپنی زندگی میں کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔البتہ ملک مقبول احمد نے وہ رقم اقساط میں ادا کر دی اور آخری قسط اس وقت دی گئی جب ملک اللہ داد خان صاحب اس دنیا میں موجود نہ تھے۔وہ آج بھی اس احسان کو بھلا نہیں سکے۔''سفر جاری ہے'' میں ان کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان پر احسان کرتا ہے تو وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرتے بلکہ اس کا ذکر خیر کرتے نہیں تھکتے۔تمدن عرب کے بعد انہوں نے تمدن ہند، سیرت ابن ہشام اور عبرت نامہ اندلس ایسی ضخیم کتب شائع کیں۔سیرت ابن ہشام کا نسخہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی سے حاصل کر کے ان کے تحریر کردہ دیباچے سمیت شائع کر دیا۔ملک صاحب ان کے عقیدے سے قطعاً نا آشنا تھے۔سید نفیس الحسینی نے دیباچے کی وجہ سے ملک صاحب کے عقیدے پر اعتراض کیا تو محمد شریف قاسمی نے ان کا یہ اعتراض ملک مقبول احمد کو پہنچا دیا۔جس کی وجہ سے انہیں بڑی ندامت ہوئی اور اپنا عقیدہ بیان کیا تو دونوں صاحبان مطمئن ہو گئے۔بعد ازاں محمد اسماعیل پانی پتی کا دیباچہ کتاب کی قلمرو سے نکال کر اس کا ترجمہ احسان الحق سلیمانی سے کروایا گیا جو بڑے عالم فاضل اور محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔مقبول اکیڈمی نے سٹالن گراڈ، تیمور، ہمایوں، القاہرہ، الجزائر، استنبول صقلیہ اور بحری عقاب جیسے تاریخی ناول، معروف ناول نگار محمد سعید سے لکھوا کر شائع کیے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے رہے۔

لاہور کے معروف پبلشر عبدالحمید نظامی نے مقبول اکیڈمی سے بچوں کی چند

چھوٹی چھوٹی کتابیں کثیر تعداد میں خرید کیں تو ملک صاحب کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ اتنی کتب کہاں سپلائی کریں گے۔ کھوجنے پر معلوم ہوا کہ کتب محکمہ تعلیم کو سپلائی کی جاتی ہیں اور اس کے ٹنڈر اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ ان ٹنڈروں میں حصہ لینے لگے۔ اس طرح ان کے لیے ترقی کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔

ملک صاحب وہ خوش بخت انسان ہیں کہ جنہوں نے چار دفعہ حج اکبر اور کئی مرتبہ حج اصغر ادا کیے۔ پہلا حج اپنی اہلیہ کے ہمراہ 1986ء میں ادا کیا۔ دوسری مرتبہ بھی 2002ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ 2006ء میں ان کی بیوی گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکیں تو وہ اکیلے ہی حج پر روانہ ہو گئے۔ سفر جاری ہے میں انہوں نے نہایت مختصر انداز میں سفر تا حج کا ذکر کیا ہے جو صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر وہ سفرنامہ نگار ہوتے تو ایک ضخیم کتاب صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگتی۔ تاہم انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس روحانی سفر پر جو صفحات قلم بند کیے ہیں۔ انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک سفرنامہ نگار بھی چھپا بیٹھا ہے۔ جس کا سراغ وہ ابھی تک نہیں لگا سکے۔ امید ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے اندر کے خود نوشت نگار کا کھوج لگا کر اس سے خوبصورت اور معیاری خودنوشت تحریر کروائی ہے۔ اسی طرح وہ کسی روز اپنے اندر کے سفرنامہ نگار کو بھی تلاش کر لیں گے اور اس سے اس روحانی سفر کو اتنے دلنشیں انداز میں لکھوائیں گے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ خود ملک صاحب کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک ہو اور ان تمام روحانی مناظر کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔

زندگی واقعات، حادثات اور سانحات کی ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر سے ہر ذی شعور انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔ سفر جاری ہے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ملک مقبول احمد کو بھی اپنی زندگی میں چند حادثات سے گزرنا پڑا۔ جنہوں نے ان کی زندگی پر گہرے

اثرات مرتب کیے ہیں۔ 6 ستمبر 1965ء کی رات کی سیاہی ابھی دن کے اجالے میں مبتدل نہ ہو پائی تھی کہ بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ٹینکوں اور توپوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ رات کے سناٹے کے سینے میں جگہ جگہ شگاف ڈالنے لگی۔ پاکستان کی فوج فوری طور پر اپنے وطن عزیز کے دفاع کے لیے پہنچ گئی تو بھارتی فوج کی پیش قدمی رک گئی۔ ملک صاحب کا گاؤں دیووال سیالکوٹ کی سرحد پر واقع تھا۔ بھارتی قبضے میں چلا گیا اور وہاں کے باسی بھارتی قیدی بن گئے۔ جن میں ملک صاحب کی بیمار پھوپھی شامل تھیں۔ تین ماہ کے بعد مریضہ ہونے کی وجہ سے انہیں رہا کر دیا گیا مگر اس دوران وہ اپنا دماغی توازن کھو چکی تھیں۔ ان کی بقیہ زندگی اسی حالت میں گزری۔ یہ حادثہ ان کی زندگی کا ایک ایسا سانحہ ہے جسے وہ کبھی نہیں بھلا سکے۔

دوسرا حادثہ تیز رفتار گاڑی چلانے کی عادت کی وجہ سے ملتان اور ساہیوال کے درمیان نہر کا ایک پل عبور کرتے ہوئے پیش آیا۔ جس میں زندگی موت کو ہاتھ لگا کر واپس آ گئی تو ملک صاحب نے کچی زمین پر سجدہ شکر ادا کیا۔ تیسرا حادثہ ان کی ''بے جی'' کے انتقال کا تھا جو ان سے عشق کی حد تک محبت کرتی تھیں۔ کئی سال تک ملک صاحب ان کی جدائی کی شال میں لپٹے پھرتے رہے اور اب بھی انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کے اردگرد موجود ہوں۔ چوتھا حادثہ جب وہ شیطان کو کنکریاں مارنے جا رہے تھے تو قدآور حبشی حجاج کے ایک ریلے کی زد میں آ کر زمین پر گر پڑے مگر منیٰ کے فرش پر چت گر کر کچلے جانے سے قبل ہی انہیں کسی غیبی طاقت نے کھڑا کر دیا ورنہ منیٰ کے میدان میں گرے ہوئے حاجی کا کھڑا ہونا ممکنات میں نہ تھا مگر ان کی زندگی باقی تھی وہ بچ گئے۔ پانچواں حادثہ ان کے ابا جی کی رحلت کا تھا۔ جو اپنی شریک حیات کی جدائی کے غم میں گھل گھل کر یکم مارچ 1988ء کو اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے سایہ دار درخت سے محروم ہو گئے جو ان کی

زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں اپنی گھنی چھاؤں سے انہیں راحت پہنچایا کرتا تھا۔ چھٹا حادثہ اس وقت پیش آیا جب وہ گلشن پارک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ 10 دسمبر 1989ء کی ایک شام ان کے گھر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکو ان کی ملازمہ کو زخمی کر کے گھر کا سارا قیمتی سامان لے گئے اور پولیس میں رپورٹ درج کروانے کے باوجود اب تک نہ پکڑے گئے۔ اس کے بعد گھر والوں کے دلوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ مکان فروخت کر دیا گیا۔

ملک مقبول احمد اہل قلم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں۔ مگر کچھ وکھری ٹائپ (یہ ترکیب ملک صاحب کی اختراع ہے) کے لوگوں سے انہوں نے دکھ اٹھائے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا نام مخفی رکھتے ہوئے ''سفر جاری ہے'' میں وکھری ٹائپ کے لوگ کے عنوان سے ایک باب رقم کیا ہے۔ (1) سیرت ابن ہشام کا نیا ترجمہ احسان الحق سلیمانی سے کروایا گیا۔ اس کتاب کی پروف ریڈنگ خود ملک صاحب نے کی پھر ایک معروف ادیب کو پروف ریڈنگ کے لیے دیا تا کہ باقی ماندہ غلطیوں کو بھی حدود کتاب سے باہر نکال دیا جائے۔ کافی عرصہ کے پرزور اصرار کے بعد انہوں نے مسودہ واپس کر دیا۔ پروف ریڈنگ تو کجا اس نے بنڈل کو کھول کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی اور بل کی ادائیگی پر اس قدر اصرار کیا کہ اسے مطلوبہ رقم ادا کرنا پڑی اور پروف ریڈنگ کے لیے کسی اور صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔

(2) ایک نامور ادیب اور صحافی نے ان سے اپنی خاکوں کی کتاب شائع کرنے کا معاہدہ کیا اور پیشگی رقم بھی وصول کر لی۔ جب کتاب تمام مراحل طے کر کے اشاعت کے دائرے میں داخل ہوئی تو ان پر انکشاف ہوا کہ وہ کتاب پہلے ہی کسی نئے پبلشر نے شائع کر دی ہے۔ شاید اس پبلشر نے اسے زیادہ معاوضہ ادا کر دیا تھا۔ (3)

ایک نامور دانشور ادیب نے ملک صاحب سے متعدد جلدوں پر مشتمل دو ضخیم سلسلہ وار کتابوں کی اشاعت کا معاہدہ کیا اور ابتدائی چند کتب کا کچھ معاوضہ بھی وصول کر لیا۔ کتابوں کو کمپیوٹرائزڈ کروایا گیا اور وہ دانشور مسودے پر ایک نظر ڈالنے کے لیے لے گیا اور دس بارہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مسودہ واپس کیا نہ رقم مگر ملک صاحب اب اس کی ناز برداری میں مصروف ہیں پرانے دوست جو ہوئے اور ملک صاحب کو دوستی کا رشتہ بہت مقدم ہے۔

(4) ایک دیرینہ دوست جو ایک معروف ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول کی کمپوزنگ میں دو چار غلطیاں رہ گئیں تو اس نے اپنے وکیل کی معرفت انہیں نوٹس بھجوا دیا کہ کسی مخالف کے کہنے پر دانستہ غلطیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ جس سے ملک صاحب کو شدید صدمہ پہنچا۔ (5) بچوں کے ایک معروف ادیب نے ان سے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا تو چار ہزار روپے پیشگی دیتے ہوئے ایک مضمون پر کتاب لکھنے کو کہا۔ ایک سال گزر جانے کے باوجود ان کی طرف سے کوئی پیش رفت کی اطلاع نہیں ملی۔ فون کریں تو اس کی طرف سے جواب ندارد، افسوس بچوں کے ننھے ننھے ذہنوں کو روشنی مہیا کرنے والا یہ ادیب خود اخلاقی اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ (6) ایک نوجوان شاعر نے اپنا کلام چھپوانے کے لیے ادارے کے کئی چکر لگائے۔ اس کی کتاب کا پیش لفظ محترمہ یاسمین حمید صاحبہ کا لکھا ہوا تھا اور چند سطور ڈاکٹر اختر شمار نے بھی اس کی تعریف میں تحریر کی تھیں۔ یاسمین حمید صاحبہ نے ایک خط کے ذریعے اس پیش لفظ سے انکار کیا تو ملک صاحب نے خط کے لیے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حرکت اس شاعر نے کی تھی اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے بعد مقبول اکیڈمی کے تمام در اور دریچے اس کے لیے بند ہو گئے۔ (7) اس قسم کے چند کردار ملک صاحب کی کاروباری برادری میں بھی موجود ہیں۔ ان کی کاروباری برادری کے ایک شخص نے بیس برس قبل ان سے بیس ہزار روپے کتابوں

کے ایک اہم آرڈر کی تکمیل کے لیے ادھار لیے تھے۔ خلوص نیت سے دی ہوئی وہ رقم ابھی تک ادا نہیں کی گئی۔ اُس طرف سے رقم کی واپسی کے وعدے تو بہت ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ادا نہیں ہوئے۔ وکھری ٹائپ کے لوگوں میں نامور شاعر بھی ہیں ادیب بھی سکالر بھی ہیں ناول نگار بھی۔ صحافی بھی ہیں کالم نگار بھی، پبلشر بھی ہیں اور پروفیسر ادیب بھی۔

''سفر جاری ہے'' کے مطالعہ سے ملک مقبول احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنی صحت کا اس قدر خیال نہ رکھ سکے جتنا کہ رکھنا چاہئے تھا۔ چنانچہ وہ مختلف قسم کی بیماریوں کے نرغے میں آ گئے۔ نزلہ زکام، دردسر، سانس کی تکلیف، قبض کا ہونا، جسم کے مسام بند ہونے کی وجہ سے پسینے کا نہ آنا، جسم کے مختلف حصوں میں دردوں کا ہونا وغیرہ۔ جوانی میں قوت مدافعت کی وجہ سے جسم ان تمام بیماریوں کا مقابلہ کرتا رہا مگر جب شباب کا سورج ڈھلنے لگا اور نقاہت کے سایے بڑھنے لگے تو مختلف قسم کی بیماریاں زور پکڑنے لگیں۔ مختلف قسم کے قابل اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود بیماریاں اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے لگیں اور ان کے وزن میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو ان کے بیٹے ڈاکٹر ظفر نے سٹیم باتھ کا مشورہ دیا۔ لوئی کوہنی کی کتاب جس کے جرمن زبان میں پچاس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ سروتر کرشن سروپ نے ''نیا علم شفا بخشی'' کے عنوان سے کیا تھا۔ ملک صاحب نے اس میں درج شدہ ہدایات کے مطابق اپنا علاج شروع کیا۔ پانی کے اس علاج سے (جس میں ہپ باتھ اور سٹیم باتھ دونوں شامل تھے) کچھ عرصہ بعد جسم سے فاسد مادوں کا اخراج شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے جسمانی کمزوری کا پلڑا جھکنے اور بیماریوں کا اوپر اٹھنے لگا اور بڑھتا ہوا وزن کم ہونے لگا۔ ان کا فربہ جسم سلم اور سمارٹ ہو گیا وہ پھر سے عالم شباب میں داخل ہو گئے۔ اس طریقہ علاج سے انسان کی جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ صرف قوت ارادی، مستقل مزاجی اور صبر و

ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ان کی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مرزا ادیب اپنے ایک خط میں علاج کے بعد ان کی صحت کے بارے میں اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''سب سے پہلے تو میں اپنی اس خوشی کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ ماشاءاللہ جوان رعنا بن گئے ہیں۔ بہت ہی اچھی صحت عمر سے خاصی کم اور چہرے پر زندہ دلی کے نمایاں اثرات اور کیا کہا جائے۔''

ملک مقبول احمد نے اپنی بے پناہ کاروباری مصروفیات کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ رب قدیر نے انہیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ تینوں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ہیں۔ ان کی ایک بہو اور داماد بھی ڈاکٹر ہیں۔ کتابوں کا کاروبار کرنے والے سخن کا گھرانہ ڈاکٹروں کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کی شریکِ حیات بھی برابر شامل رہی ہیں۔

سفر جاری ہے کسی پبلشر کی پہلی خودنوشت ہے۔ اس آپ بیتی پر پروفیسر جمیل آذر جیسے جید ادیب نے ''راہ نوردِ شوق'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار ادیبوں نے اس کی تعریف میں مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ خودنوشت اُردو آپ بیتی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور امید ہے کہ اس خودنوشت کی طرح ملک صاحب سفرنامہ حج بھی اردو ادب کے دامن میں ڈالنے کی تیاری شروع کر دیں گے۔



انوار فیروز

اُردو کے معروف شاعر اور ممتاز صحافی انوار فیروز 5 جون 1938ء کو بھارتی پنجاب کے مشہور شہر حصار میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد گرامی ڈاکٹر اظفر حسین اظفر نے ان کا نام انوار احمد خان رکھا تھا۔ 1947ء میں وہ اپنے بڑے بھائی منصب معین خان کے پاس قیام پذیر تھے جو تی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے شاعری میں قدم رکھا تو ہندوستان میں اپنی آخری قیام گاہ ''فیروز پور'' کی یاد قائم رکھنے کے لیے فیروز تخلص اختیار کیا۔ شاعری کا ورثہ والد سے ملا تھا۔ انوار فیروز نے خود شاعری میں نام پیدا کیا اور یہ ورثہ اپنی اولاد کو بھی منتقل کیا۔ ان کی بڑی صاحبزادی نورین طلعت عروبہ کی شاعری کی کتابیں اہل اَدب سے تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

انوار فیروز محنت میں یقین رکھنے والے اَدیب ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد انہیں اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کی تکمیل کے لیے پرائیویٹ طور پر امتحان پاس کیے اور اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشن پڑھاتے رہے۔ 1959ء میں بی۔اے کر کے ہری پور ہزارہ میں افسر تعلقات عامہ بن گئے۔ لیکن سرکاری نوکری راس نہ آئی۔ 1962ء میں روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی میں صحافت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ ایم اے اردو 1967ء میں کیا۔ نظریاتی اخبار نوائے وقت کا اجرا راولپنڈی سے ہوا تو انہوں نے اس اخبار کی ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے ایران، سنگاپور، ترکی، برطانیہ، جرمنی، امریکہ اور سعودی عرب کا سفر صحافت کے فرائض اور سیاحت کا شوق پورا کرنے کے لیے کیے۔ ان کا سفرنامہ رسالہ ''اوراق'' میں چھپ چکا ہے۔ شاعری کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور یہ سب شاعری کرتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' پر انہوں نے ایک بامعنی، باوقار اور خوبصورت تبصرہ کیا۔ میرے نام ان کے مکتوب میں یہ جملہ بڑا بامعنی ہے۔ ''ہماری مشقت کا سفر بھی جاری ہے'' میری دعا ہے کہ انوار فیروز کی کامیابیوں کا یہ سفر جاری رہے۔



انوار فیروز
معرفت ''نوائے وقت'' اسلام آباد

الفاظ کا جادوگر

پروفیسر جمیل آذر نے اپنی کتاب ''راہ نوردِ شوق'' دی جو دراصل مقبول اکیڈمی لاہور کے ملک مقبول احمد کی خودنوشت کے بارے میں ہے۔ اس میں جمیل آذر نے یہ انفرادیت پیدا کی کہ ساتھ اپنی خودنوشت بھی شامل کر دی، میں نے سوچا کہ ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' بھی پڑھنی چاہئے۔ جس کے بارے میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے مضامین پڑھ چکا تھا اور مجھے اشتیاق تھا کہ میں ملک مقبول احمد کی داستان حیات پڑھوں کہ انہوں نے کس طرح اپنی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کیا اور ان پر کس طرح قابو پایا۔ میں نے جمیل آذر سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ٹیلی فون پر ملک مقبول احمد سے بات کی اور تیسرے چوتھے دن انہوں نے مجھے ''سفر جاری ہے'' بھیج دی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دینی کتابیں بھی بھیجیں۔

میں نے مقبول اکیڈمی کا نام تو سنا تھا لیکن ملک مقبول احمد سے واقف نہیں تھا۔ تاہم ادیبوں اور شاعروں کے تبصرے پڑھ کر مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ملک مقبول احمد جو سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے اور زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔

انہوں نے لاہور آ کر پہلے ایک رسالہ ''چودھویں صدی'' نکالا اور اس طرح اپنے خواب کو تعبیر دی، اس کے بعد مشکل حالات میں مقبول اکیڈمی قائم کی اور دوسروں کی کتابیں چھاپنا شروع کیں، اس دوران انہیں کن کن مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔

میں نے کتاب پوری پڑھی اور مجھے احساس ہوا کہ ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ چھپایا نہیں بلکہ سب کچھ سچ بیان کر دیا یہاں تک کہ اپنی عاشقی کا قصہ بھی بیان کر دیا۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ میں شروع کر کے اسے ختم کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ملک مقبول احمد کا یہ کہنا کہ انہوں نے واجبی سی تعلیم حاصل کی اور وہ اَدیب ہیں نہ شاعر، بس اپنے پوتے پوتیوں اور نواسیوں کے اصرار پر اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ کتاب پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ملک مقبول احمد نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ ان کا انداز بیان اتنا خوبصورت ہے کہ کیا کسی ادیب کا ہوگا۔ الفاظ کی ترتیب اس طرح ہے کہ لگتا ہے۔ وہ ملک صاحب کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ تحریر میں روانی اور شگفتگی ہے۔ جس سے کتاب میں قارئین کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

ملک مقبول احمد نے شہرہ آفاق فلسفی ژاں ژاک روسو کی طرح ہر وہ بات جو قابل تعریف یا قابل اعتراض تھی۔ پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے۔ نہ انہوں نے کوئی ''جرم'' چھپایا ہے اور نہ ہی اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا ہے۔ وہ جیسے ہیں خود کو انہوں نے دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا۔ یہی اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ملک کے ممتاز اَدیبوں اور شاعروں نے جن کی تعداد سو کے قریب ہے، کتاب کے بارے میں مضامین لکھے اور بجا طور پر شاندار الفاظ میں ملک صاحب کو یہ

کتاب لکھنے پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ملک مقبول احمد کی خودنوشت میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ان کی تحریر میں پہاڑی جھرنوں جیسی روانی اور نغمگی ہے۔ہمیں اس کتاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو مشکلات سے گھبرانے کے بجائے عزم وہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مشکلات رائی کا پہاڑ ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے پوری کتاب پڑھ کر کہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ ایک کم پڑھے لکھے شخص نے لکھی ہے۔ بلکہ یہ محسوس ہوا کہ یہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستند ادیب نے لکھی ہے۔انہوں نے جگہ جگہ اشعار استعمال کئے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ شعری ذوق کے حامل ہیں اور موقع محل کے حساب سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

جس طرح برادر محترم جمیل آذر کو اس کتاب میں اپنی گزری ہوئی زندگی نظر آئی، اسی طرح مجھے بھی اپنی مشکلات یاد آ گئیں۔ہم لوگ فیروز پور شہر سے ہجرت کر کے کیمبل پور آئے تھے۔یہاں محکمہ بحالیات نے ہمارے والد صاحب کو شہر کا سب سے اچھا مکان اور دکان دینے کی پیشکش کی کیونکہ قیام پاکستان سے غالباً ایک سال قبل والد صاحب نے پنشن کمیوٹ کرا کے دکان کھولی تھی۔مگر والد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حالات بہتر ہونے پر ہم لوگ فیروز پور واپس جائیں گے۔ ہم لوگ تین کپڑوں میں آئے تھے، پھر ہوا یوں کہ ایسا مکان لیا جو بالکل خالی تھا جس میں پانی کا نل تک نہیں تھا۔اس زمانے میں کیمبل پور میں بچھو بہت نکلتے تھے۔اور ہم لوگ فرش پر سوتے رہے۔میری تعلیم چھوٹ گئی۔ بعد میں میں خود پڑھتا رہا اور ٹیوشن پڑھاتا رہا۔ گھر کے ایک کمرے میں دکان کھولی تھی وہاں بیٹھتا اور ملازمت بھی کرتا رہا۔ جب میری شادی ہوئی تو میں میٹرک پاس تھا۔اس کے بعد ایف اے اور بی۔اے کیا اور

محکمہ وبلیج ایڈ ہری پور ہزارہ میں افسر تعلقات عامہ مقرر ہوا۔ جولائی 1961ء میں یہ محکمہ ختم ہو گیا تو واپس کیمبل پور چلا گیا۔ پھر سال ڈیڑھ سال بعد روزنامہ تعمیر راولپنڈی میں چیف رپورٹر مقرر ہوا۔ اور سال بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں ایم اے (اُردو) میں داخلہ لیا اور 1967ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ یعنی میں نے بھی سخت محنت کی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا پھل دیا۔ میں بھی مشکلات سے گھبرایا نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ترقی کے در کھول دیئے۔

ملک صاحب نے ضرورت کے وقت اپنوں سے روپے مانگنے کا جو قصہ لکھا ہے وہ میرے ساتھ بھی بیت چکا ہے۔ میں نے جب راولپنڈی میں مکان بنانا شروع کیا تو پیسے ہی نہیں تھے، ریڈیو پاکستان پر کام کیا۔ وہاں سے تین سو روپے مہینہ ملتے تھے۔ ایک سال تک وہ جمع کر کے مکان کی بنیادیں شروع کرائیں اور پھر روزنامہ تعمیر سے تنخواہ ملنے پر کام جاری رکھتا تھا۔ روزنامہ تعمیر میں ہمیں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کو تنخواہ اور بیسویں تاریخ کو ایڈوانس ملتا تھا۔ ایک بار یکم کو مجھے مستری کو پیسے دینا تھے۔ ایک تاجر دوست سے (جس کے میں نے کئی کام کرائے تھے) سو روپے مانگے اور چیک دینے کی پیشکش کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ بہر حال میں نے اکاؤنٹنٹ کی منت خوشامد کر کے پیسے لے کر مستری کو دیئے۔ اس کے برعکس کراچی میں میرے ایک دوست امیر احمد خان (سکیورٹی پیپرز میں تھے) کا ایک بار خط آیا انہوں نے لکھا کہ تم نے مدت سے خط نہیں لکھا کیا بات ہے؟ میں نے یونہی سرسری ساذکر کیا کہ مکان شروع کر رکھا ہے۔ 5 ہزار روپے ہوں تو شاید مکمل ہو جائے۔ ایک ہفتے کے اندر ان کا خط آیا جس میں 5 ہزار روپے کا ڈرافٹ تھا اور ساتھ یہ خط تھا۔ ''انوار بھائی! 5 ہزار روپے ارسال ہیں، امید ہے تمہارا مکان مکمل ہو جائے گا۔'' یہ خط پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کہ ایک

دوست سے سو روپے مانگے اس نے نہیں دیئے اس دوست سے مانگے نہیں یونہی ذکر کیا اور اس نے 5 ہزار روپے بھیج دیئے۔ مکان مکمل ہونے پر جب نچلا حصہ کرائے پر دیا اور مجھے اس کا ایڈوانس اڑھائی ہزار روپیہ ملا تو میں نے اپنے دوست امیر احمد خان کو بھیج دیے۔ ان کا پھر خط آیا۔ کہ میں نے بھی مکان بنایا ہے۔ مجھے احساس ہے اس لئے ایسی کیا جلدی ہے کہ تم نے پیسے بھیجے۔ جب ملک صاحب کا قصہ پڑھ رہا تھا تو میری آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔

دیہی زندگی کی عکاسی بھی ملک مقبول احمد نے خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ اس زمانے میں انسان سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس میں خلوص اور محبت تھی۔ اب تو منافقت کا دور ہے۔ میں کبھی کبھی شہر کی زندگی سے اکتا جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کاش کسی گاؤں میں میری زمین ہوتی، وہاں اپنی ضرورت کا اناج، پھل اور سبزیاں کاشت کرتا وہیں رہائش رکھتا۔ گائے بھینس، بکری اور مرغیاں پالتا۔ مگر اب تو دیہات بھی وہ نہیں رہے۔ دیہات میں محلات بن رہے ہیں اور سوچتا ہوں کہ یہی صورت رہی تو کھانے کو کہاں سے آئے گا۔

پہلے ایڈیشن کی کتاب کے 455 صفحات تھے جو بعض احباب کے کہنے پر ملک صاحب نے مختصر کر کے اب 200 صفحات کر دیئے۔ نہ جانے میں کن باتوں سے محروم رہ گیا ہوں جو حذف کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ ملک صاحب نے وہی کچھ لکھا تھا جو ان پر بیتا تھا۔ کچھ اور لوگوں کی منافقت کو بھی شاید انہوں نے بے نقاب کیا ہو۔

ملک مقبول احمد کا مشاہدہ گہرا ہے اور بعض جگہ انہوں نے خوبصورت جذبات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ میں تو کتاب پڑھتے ہوئے کھو سا گیا تھا اور ملک صاحب کی خوبصورت تحریر کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا کہ ملک مقبول احمد الفاظ

اور جذبات کے جادوگر ہیں جنہوں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ جس خودنوشت کی سو سے زائد ادیبوں اور شاعروں نے تعریف کی ہو، اس پر مجھ جیسا ادب کا ادنیٰ طالب علم کیا تبصرہ کر سکتا ہے۔

ملک مقبول احمد کسی بات یا واقعہ کا ذکر اتنی خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ اس واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ مثلاً جب وہ اپنے چوبارے سے کشمیر کی برف پوش چوٹیوں کو دیکھتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی ان کے ساتھ دیکھ رہا ہوں اور یہی واقعہ نگار کی خوبی ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک کی زندگی کے واقعات دلچسپ ہیں اور سبق آموز بھی۔ اب مجھے یقین ہے کہ ملک صاحب نے کبھی ڈائری نہیں لکھی ہوگی۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی یادداشت کے بل پر لکھا ہے اور بچپن سے لے کر موجودہ دور کے حالات اتنے تفصیل سے لکھنا بھی ایک منفرد فن ہے۔ گویا ملک صاحب کے ذہن میں تمام داستان کی فلم چلتی رہی اور وہ قلمبند کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت بھی دی، قابل اور محنتی اولاد بھی، ان کی سب سے بڑی دولت ان کی نیک اولاد ہے۔

انہیں اللہ تعالیٰ نے صحت وتندرستی سے بھی نوازا۔ انہوں نے 38 سال سے کوئی دوا استعمال نہیں کی، ملاوٹ اور ماحولیاتی آلودگی کے اس دور میں یہ بھی ایک نعمت ہے۔ برادرم جمیل آذر نے مجھے بھی اپنا علاج واٹر تھراپی کے ذریعے کرنے کو کہا اور یہ انہوں نے ملک مقبول احمد سے سیکھا ہے لیکن اس کے لئے وقت کی ضرورت ہے جو ہم جیسے مزدور کے پاس نہیں ہے۔

ملک مقبول احمد نے یہ خوبصورت خودنوشت لکھ کر ادیبوں کو ایک راہ دکھائی ہے، انوکھی اور منفرد۔ انہوں نے بتایا کہ انسان کی محنت کبھی اکارت نہیں جاتی۔ جدوجہد سے مشکلات اور مصائب کے سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں۔ کاش کبھی میں بھی اپنی ایسی خوبصورت خودنوشت لکھ سکوں۔

صائمہ نورین بخاری

صائمہ نورین بخاری 14 اگست 1972ء کو پیدا ہوئیں، آپ کا تعلق ملتان کے معروف علمی ادبی سادات گھرانے سے ہے، ان کے بزرگوں میں خواجہ حسن نظامی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ان کے دادا سید قاسم علی دہلوی آل انڈیا ریڈیو سے بحیثیت مصنف و شاعر منسلک رہے۔ ان کی والدہ شاہدہ فاروقی اور خالہ رعنا فاروقی بھی ادیبہ تھیں۔ علمی و ادبی سفر کا آغاز کیا گیارہ برس کی عمر میں اخبار "امروز" میں "بچوں کی دنیا" سے کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "پل صراط" کے نام سے شائع ہوا۔ جس کی ڈرامائی تشکیل سے صائمہ نورین کی فنی و ادبی پہچان ثابت ہوئی۔ ان کے افسانے اظہر جاوید کے رسالہ "تخلیق" میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں اور اس رسالے کے خطوط کے کالم میں پڑھنے والے ان کی تحسین کرتے ہیں۔ صائمہ نورین بخاری مقرر بھی ہیں اور تقریری مقابلوں میں کئی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین خانیوال میں بطور آنریری لیکچرار خدمات سرانجام دیں لیکن اب زیادہ وقت ادب کو دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "منظر خواب دریچے" اور شعری مجموعہ "سفر آغاز کرتے ہیں" منظر عام پر آ کر پذیرائی کر چکے ہیں۔ "سفر جاری ہے" پر ان کا تبصرہ اس کتاب میں شامل ہے۔





صائمہ نورین بخاری
ضلع خانیوال ڈویژن ملتان

خوشبو کا سفر

کتاب کی خاموش زبان سے شناسائی اور اس کے باطن میں چھپی دانش سے آشنائی رکھنا اور اس کی گویائی کے سمندر سے آنے والی پراسرار ہواؤں سے باتیں کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں..... یہ دل فریب کام اگر فلسفی، شاعر، ادیب، نقاد اور اہل دانش کریں تو علم کی جادونگری میں فکر واحساس کی سحر انگیز فضا جنم لیتی ہے..... تخلیق کا عمل الفاظ تراشنے لگتا ہے اور اگر یہی کام، فکر واحساس کی اس قوس وقزح کو سمیٹنے والا، الفاظ کو کتاب کے سانچے میں ڈھالنے والا طابع (پبلشر) کرے تو علم کی نگری میں کتاب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے..... اور اگر یہ کہیں کہ جناب ملک مقبول احمد صاحب سلطنت علم کی ایسی ہی جادونگری کے سچے، رحم دل، انصاف پسند اور مہربان بادشاہ سلامت ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔......

مجھے جناب ملک مقبول احمد کی مشفق، علم دوست اور مہربان شخصیت سے اُردو ادب کے بلند پایہ ادیب، انشائیہ نگار و نقاد جناب جمیل آذر کی کتاب ''راہ نوردِ شوق'' نے متعارف کروایا۔ جناب جمیل آذر کی یہ منفرد، خوبصورت انشائی تنقید پڑھ کر ایک عجیب سا حیران کن مگر خوش گوار سا احساس دل کو بوجھل کر گیا..... یونہی الجھتے سلجھتے

سوچا...... کیا؟ ادبی سیڑھیوں اور سہاروں کے اس دور میں یہ ممکن ہے کہ کوئی کتاب ایک ادیب ونقاد کو اس قدر متاثر کرے کہ وہ نارسی سس کی طرح اس کے حسن کی جھیل میں غرق ہو جائے؟..... کتاب پر کتاب تخلیق ہو جائے؟ اور یہ الجھن...... ایک حیرانی میں اس وقت تبدیل ہو گئی جب اس امر پر غور کیا کہ ''راہ نوردِ شوق'' نے کسی باقاعدہ مصنف کی تحریر سے متاثر ہو کر نہیں جنم لیا بلکہ اس کتاب کے پیچھے ''سفر جاری ہے'' کی آپ بیتی کا محرک کارفرما ہے........ جس کے مصنف تو ایک سادہ دل اور مقبول ومعروف پبلشر ہیں....، گویا..... ایک الجھن.... ایک گنجلک اور بڑھ گئی...... اس کرخت Blunt & Bold دور میں سادہ دلی اور مقبولیت ایک ساتھ...... کچھ سمجھ نہیں آیا..... ویسے ایک سچی بات بتاؤں بحیثیت قوم تو ہم ویسے ہی بہت سے مخمصوں، الجھنوں اور حیرانیوں کا شکار ہو چکے ہیں..... لیکن 1971ء کی جنگ کے بعد پیدا ہونے والی ''پاکستانی مخلوق'' تو بہت ہی دکھی ہے...... ہمیں بہت سی سیدھی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں..... ہمارے بڑے جب ہمیں قیام پاکستان سے پہلے کے حالات واقعات بتاتے ہیں تو وہ ہمیں کسی Fairy Tale کی طرح محسوس ہوتے ہیں....... ہمیں اس وقت کے حادثات بھی...... آج کے خوفناک حالات کے مقابلے میں رومانوی واقعات کی کوئی کڑی معلوم ہوتے ہیں...... ہمیں اور بھی چیزیں حیران کرتی ہیں جیسے آمریت اور جمہوریت کا ساتھ ساتھ چلنا، سیاست دانوں اور افسروں میں سے کسی کا دیانت دار ہونا...... شادی یا مرگ کی محافل ورسومات میں کسی فردِ واحد کی تعریف پر سب کا متفق ہونا...... ہمارے زمانے کے ''عظیم'' گلوکاروں کی کلاسیکی موسیقی میں دل چسپی کی نشان دہی ہونا...... اداکاراؤں کا صرف اداکاری کرنا...... ہوش ربا مہنگائی میں کسی کا بے وجہ سخی ہونا ...... کسی کا بے سبب اچھا ہونا، ڈاکٹر کا فیس نہ لینا، عاشقوں کا شادی شدہ

ہونا..... کتابوں کے بنڈلوں میں دبے ہوئے ادیب کا سر پھرانہ ہونا، مشاعروں میں شعراء کرام کا ایک دوسرے کو داد دینا اور وہ بھی دل سے ایسے میں کسی پبلشر کا مصنف ہونا اور ایسی تہلکہ خیز "آپ بیتی" تحریر کرنا کہ برصغیر کے نامور ادیب نارسی سس بن کراس کے حسن کی جھیل میں اپنا عکس دیکھنے لگیں اور ان کی خوشی "پذیرائی" جیسی ضخامت اختیار کر جائے Amazing......

مگر میری یہ حیرائی، حقیقی مسرت و انبساط میں اس وقت بدل گئی جب ملک مقبول احمد صاحب نے جناب پروفیسر جمیل آذر سے عقیدت کے سفر کو جاری وساری رکھتے ہوئے، مجھے یہ خوبصورت خودنوشت سوانح عمری تحفتاً ارسال فرمائی..... سچائی، سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور تحریر نے کچھ اس طرح توجہ کو سمیٹا کہ ایک ہی نشست میں کئی اوراق نگاہ میں اترتے چلے گئے..... یوں محسوس ہونے لگا کہ پہاڑوں سے لپٹی ہوئی برف، سورج کی سنہری کرنوں نے پگھلا کر رکھ دی ہے..... ہوا زرد چادر سے اپنے بکھرے بالوں کو ڈھانپے، گئے موسموں کو صدا دے رہی ہے..... تتلی، جگنو، پہاڑ، پرندے، گئے موسموں کا دکھ درد سمیٹے، اپنی اپنی کہانیاں سنا رہے ہیں اور زندگی کے جزیرے پر روحانی خوشی کی تلاش کا سفر جاری ہے..... مشقت، دیانت اور صداقت کا سفر...... جس میں بہت سی جسمانی، خوشیوں اور خواہشوں کی قربانی دے کر ہی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے......

دکھوں، غموں، خوشیوں کے بادلوں میں اگر سچائی، اور سادگی کی روشنی پھوٹی پڑ رہی ہو تو وہ "سفر جاری ہے" کی نوید سناتی ہوئی "پذیرائی" کا گنبد بن جاتی ہے..... گویا

بھٹکے اس اندھی بھیڑ میں تنہا تمام عمر
لوٹے جب اپنی ذات میں ہم قافلہ ہوئے

اردو سوانح عمری دراصل تاریخ کا ایک شعبہ یا شاخ ہے۔ مناقب، سیرت اور تذکرہ سب اسی ذیل میں شامل کیے جاتے ہیں...... اردو سوانح عمریوں کو اگر تین ادوار میں تقسیم کیا جائے تو پہلا دور وہ ہے جب دکنی یا قدیم اردو میں نظمیہ کتابیں رقم ہوئیں...... دوسرا دور وہ ہے جب نثر میں سوانح عمریاں مرتب کی گئیں، اور تیسرا دور وہ ہے جب جدید مغربی طرز پر سوانح عمریاں لکھی جانے لگیں...... حقیقت نگاری لازمی سمجھی جانے لگی اور تنقید کا وجود بھی ناگزیر ٹھہرا، سوانح عمری کی دو اقسام نمایاں رہیں:۔

(1) سیرت النبی ﷺ اور اکابرینِ سلف کی سوانح عمریاں

(2) ہم عصروں کی سوانح عمریاں...... جن میں مؤرخ، ادیب، مصلحِ قوم وغیرہ سب ہی شامل کیے جا سکتے ہیں...... مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون میں 753 سوانح عمریوں کی تعداد فراہم کی ...... اور جناب نصیر الدین ہاشمی کے مضمون ''اردو زبان کی قدیم سوانح عمریاں (2949)'' تک تعداد اندازاً بارہ سو تھی۔

خودنوشت یا آپ بیتی لکھنے کا رجحان تیسرے اور جدید دور میں تیزی سے پروان چڑھا...... گویا مولانا الطاف حسین حالی کے بعد سوانح عمری تجدد کی دنیا میں داخل ہوگئی...... اُردو کی مقبول خودنوشت سوانح عمریوں میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' احسان دانش کی ''جہانِ دانش''، مرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری'' وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے'' پروفیسر آغا سہیل کی ''خاک کے پردے میں''، ''نشانِ جگر سوختہ'' اور ڈاکٹر سلیم اختر کی شامل ہیں......

ان سب آپ بیتیوں میں زندگی کے دل چسپ اور کٹھن سفر کی داستان کے

ساتھ ساتھ ادبی لطافت کی چاشنی اور اسلوب کی نیرنگی بھی شامل ہے۔ ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے''......ایک ایسے مصنف کی خودنوشت ہے جو کتاب کے ہیروں کی کان کے مالک بھی ہیں......اور ان کی علمی دولت اور عالمی شہرت کو مارکوئیس پبلشنگ بورڈ نے اپنی سالانہ کتاب Who's who in the world....1999 میں تسلیم کیا ہے۔ اور ان کی اس آپ بیتی پر سینکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں...... کیونکہ ان کے اسلوب میں ڈپٹی نذیر احمد ایسی سچائی خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک انہی کی طرح کے "Self made man" کی داستان ہے......ان کی تحریر میں پریم چند کے افسانوں جیسے دیہات کے معصوم اور حسین رنگ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہوتے ہیں...... اور ان کا رومان......اے حمید کے ناولوں کی رومانوی یادوں کی طرح سحر انگیز مہک سے لبریز نظر آتا ہے......یوں لگتا ہے کہ ادب کے پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی خود بول اٹھی ہے کہ

''میری خوشبو کا سفر جاری ہے''

قارئین کرام! ہمارے ہاں عام طور پر عجز و انکساری، مجذوبوں فقیروں اور مولاناؤں کا اسٹائل سمجھی جاتی ہے...... مگر پبلشرز کے ایک بہت بڑے اجارہ دارانہ مقابلے "Monopolistic Competition" میں جناب مقبول احمد کی یہ عجز و انکساری......یہ عالمِ خودی و بے خودی، ذرا ان جملوں میں ملاحظہ کیجئے......

''میں ایک عام سا بندہ ہوں......اس کے سوا میری کوئی خصوصیت نہیں میں نہ تو دنیاوی علوم میں درک رکھتا ہوں اور نہ ہی دینی علوم میں مولوی یا مولانا ہوں، میرے شعور کی آنکھوں نے جبر، ظلم اور استحصال کو کبھی پسند نہیں کیا، میرے تمام مسائل بنی نوع انسان کے تمام لوگوں جیسے ہی رہے

ہیں......"

لہٰذا میری رائے کے مطابق تو ملک مقبول احمد نہ صرف مصنف و پبلشر بھی ہیں بلکہ جناب تو ایک ماہر معاشیات (Economist) بھی ہیں۔ جو ایک مصنف کے Budget بجٹ اور Savings بچت کا فرق بھی بخوبی جانتے ہیں اور اس استحصالی طبقے کو رائلٹی وقت پر اور بیشتر اوقات تو پہلے بھی ادا کر دیتے ہیں۔ اہل قلم کو اکثر کتابوں کا نایاب و انمول تحفہ اپنے (Expenditures) خرچوں پر عنایت فرماتے ہیں۔ گویا ان کے مسائل اور وسائل کو ایک وزیر خزانہ کی طرح نہیں بلکہ ایک اچھے معیشت دان کی طرح سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں..... ان کا واسطہ جن "امیروں" سے ہے وہ کتنے اداس رہتے ہیں۔

یہ خوش لباس بھی اکثر اداس رہتے ہیں
امیر لوگوں کی بستی غریب ہوتی ہے

آج کل ایسے "غریب شہر" میں فصیلیں اتنی اونچی ہوگئی ہیں کہ سچے ستھرے گاؤں کی ٹھنڈی ہوا کا گزر بھی یہاں نہیں ہوتا..... محبت کے ارضی مفہوم کو "گلوبل ویلج" والے بھی بھلا بیٹھے ہیں...... شبنمیں گھاس، کھلتے پھول، پہاڑوں پہ جمی برف کی نیلی روشنیاں، برسات کے بھیگے بادل اور حشرات الارض کے شور میں ڈوبی چاند کو تلاش کرتی راتیں، کھلی فضاؤں میں اڑتی کونجوں کی ڈار، مکئی اور گندم کے بھنتے دانوں کی گرم گرم خوشبو..... ملک مقبول احمد صاحب..... آپ نے ان تمام گم شدہ سچائیوں کا ہمیں ادبی لوڈشیڈنگ کے اس دور میں احساس دلایا..... اور وہ بھی اس طرح کہ اپنی منزل کے سفر کی کٹھنائیوں کو خودترسی اور احساسِ برتری کے سیاہ رنگوں سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس آپ بیتی کو ہماری آنے والی نسلیں بھی اسی شوق و ذوق اور عزت واحترام

سے پڑھیں گی...... اور یہی کہیں گی جو جناب سید قاسم محمود صاحب کے الفاظ کہتے ہیں....

''کہ عام طور پر ناشرین کو کاروباری سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، چلئے کاروبار ہی سہی، لیکن وہ لوگ نہ ہوتے تو کہاں کا غالب اور اقبال، پریم چند اور رتن ناتھ سرشار، منٹو اور انتظار حسین، یہ سب کہاں ہوتے، ان کا وجود و قیام ظاہر ہے کہ ناشرین کے دم قدم سے ہے۔''

اور ناشرین ملک مقبول احمد جیسے بااخلاق، صاف گو، ہمدرد اور بااصول ہوں تو پاؤں خود راستہ ہوتے جاتے ہیں...... منزلیں آسان لگنے لگتی ہیں...... راہ گزر پتھر کی ہو اور ہم سفر شیشے کا ہو تو بھی، ہر قدم پر عزم و ہمت اِک نیا منظر امید سجا دیتی ہے......

روزنامہ ''نوائے وقت''
ماہنامہ ''تخلیق''



عنبرین تبسم شاکر

عنبرین تبسم شاکر سپریم کورٹ کے سینئر جج جسٹس شاکر اللہ جان کی اہلیہ ہیں۔ آپ 8 اگست 1976ء کو پشاور میں پیدا ہوئیں۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد ایم۔ اے اُردو کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ کالج کے دوران بزم ادب سوسائٹی کی صدر رہیں۔ ریڈیو پاکستان پشاور سے بزم خواتین کے پروگرام میں حصہ لیتی رہیں۔ پشاور ٹی وی کے علاقائی پروگرام ہندکو کے پروگرام ''سوغات'' میں کام کیا۔ خانہ فرہنگ ایران کی ادبی تقریبات میں بطور سیکرٹری حصہ لیا۔ آپ 2005ء سے نمل (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز) میں بطور لیکچرار تعینات ہیں۔ انہوں نے پروفیسر جمیل آذر کی انشائیہ نگاری پر تحقیق کام کر کے ایم فل مکمل کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔

عنبرین تبسم شاکر کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ گھر میں ہندکو اور فارسی بطور مادری زبان بولی جاتی ہے۔ آپ ادب برائے زندگی اور ادب برائے تعمیر کی قائل ہیں۔ انشائیہ نگاری میں انہیں پروفیسر جمیل آذر کی سرپرستی حاصل ہے اور اب وہ اس شوق کی تکمیل میں مگن رہتی ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ نذرِ قارئین ہے۔



عنبرین تبسم شاکر
لیکچرار نیشنل یونیورسٹی ماڈرن لینگویجز،
(NUML) اسلام آباد

سفر جاری ہے

ملک مقبول احمد صاحب کی سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر جمیل آذر صاحب انشائی تنقید کے حوالے سے کتاب لکھ رہے تھے اور اتفاق سے میں پروفیسر جمیل آذر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اُن پر اپنے ایم فل کا مقالہ سپردِ قلم کرنے میں مصروف تھی۔ یوں ملک مقبول احمد، جمیل آذر اور میں دلچسپ رشتہ ادب میں منسلک ہو گئے تھے۔ پروفیسر جمیل آذر کا نظریہ انشائی ادب میں بھرپور شمولیت (involvement) کا ہے کہ جب تک نقاد مکمل طور پر ادب پارے میں شرکت نہیں کرتا وہ فکری انبساط سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ اِس طرح سے ہم دونوں یعنی میں اور پروفیسر جمیل آذر اپنے اپنے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کام میں مصروف تھے۔ میں بحیثیت سکالرز کے جمیل آذر پر تحقیقی اور تنقیدی کام میں مگن تھی اور پروفیسر صاحب بحیثیت تخلیق کار کے ملک مقبول احمد پر کام کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

پروفیسر جمیل آذر کے اِس ادبی سفر (Literary Odyssy) میں ساتھ رہنے سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی تخلیق کار کو لکھتے اور کام کرتے دیکھا اور لمحہ بہ لمحہ اس کے خیالات، افکار اور اسلوب نگارش کا بغور مشاہدہ کیا۔

جمیل آذر صاحب جب کوئی باب لکھ لیتے تھے تو میرے ساتھ اپنے خیالات، جذبات شیئر (Share) کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غور وفکر کے ساتھ اپنے موضوع کی تہہ تک پہنچو جب افکار کی کرنیں آپ پر اتریں اور فکری انبساط کی لہریں آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں تو انہیں اپنے سادہ اسلوب نگارش سے گرفت میں لے لیں۔ اور جس فکری کیفیت کو آپ نے محسوس کیا اُسے اپنے قاری تک پہنچائیں تاکہ وہ بھی آپ کے فکری اثاثہ سے ثروت مند ہو جائے۔ قاری کو اپنے علمی دبدبہ سے مرغوب یا خوف زدہ نہ کریں بلکہ اُسے اپنا بہت قریبی دوست سمجھیں جس نے آپ کے ساتھ چند ساعتیں گزارنی ہیں۔ اس کی ان ساعتوں کو رائیگاں نہ کریں بلکہ ثروت مند (Rich) کر دیں تاکہ وہ فکری طور پر سرشار و شادمان ہو جائے۔ اس طرح مجھے اپنا مقالہ رقم کرنے پر دوہرا فائدہ ہوا ایک تو کسی تخلیق کار کو تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے عملی طور دیکھنے کا اور دوسرا اپنے مقالہ کو اُن کے تجربہ کی روشنی میں سودمند بنانے کا، میں نے بیک وقت دو شخصیتوں کو تخلیقی نظر سے دیکھا اور لطف اندوز ہوئی۔

ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پروفیسر جمیل آذر صاحب نے مجھے عنایت فرمائی، اس کا مطالعہ کرتے ہوئے زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقفیت ہوئی، اس کتاب کے مطالعہ سے مجھ پر ملک مقبول احمد کی شخصیت کا جو انکشاف ہوا ہے۔ اسے بیان کرنا چاہوں گی:۔

آپ ایک سچے، کھرے اور محنتی انسان ہیں۔ آپ کی سوانح حیات پڑھ کر میں نے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی اور زندگی نام ہے۔ جہدِ مسلسل کا اور عمل پیہم کا۔

''سفر جاری ہے'' اس مصرعہ کی تفسیر ہے۔

ع۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

آپ کی کامیابیوں کا بڑا راز جہاں اپنی والدہ سے شدید محبت اور فرمانبرداری کا ہے۔ وہاں اللہ رب العزت کا بے پایاں فضل بھی شامل ہے۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کاروباری معاملات بہت سخت محنت و ایمان داری سے سرانجام دیئے، اور اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' آپ کے اسی سفر کی روداد ہے۔ اگر چہ آپ کی سوانح حیات بہت مختصر ہے لیکن ہر لکھنے والے نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آپ کاروباری اور سماجی معاملات میں ایک سچے اور کھرے انسان ہیں، اور یہی آپ کی نیک نامی کی بنیادی وجہ ہے۔ آپ نے جس ادیب اور شاعر سے جو بھی کاروباری معاہدہ کیا اس کی پوری طرح پاسداری کی۔

میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کروں گی کہ ہمارے ملک کے ایک مایہ ناز شاعر یوسف ظفر کو ایک ناشر نے محض اس لیے دھکا دے کر سیڑھیوں سے گرادیا تھا کہ انہوں نے اس ناشر سے اپنی کتاب کا معاوضہ طلب کیا تھا۔ جبکہ آپ کے بارے میں ہر ادیب اور شاعر نے یہی بات کی ہے کہ آپ امانت، دیانت اور صداقت کے پیکر ہیں۔

ہر ادیب نے آپ کی سوانح عمری کو ایک دل چسپ ، خودنوشت سوانح حیات کہا ہے اور میں نے خود اس کو دل چسپ اور فکر انگیز پایا۔ حمید اختر ہمارے ملک کے مشہور ادیب و دانشور ہیں۔ آپ کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''ملک مقبول صاحب کی سرگزشت سیدھی سادھی، سلیس مگر شگفتہ زبان میں سامنے آئی ہے۔ رسمی و روایتی تعلیم نہ حاصل کرنے کے باوجود ان کی تحریر، زبان و بیان کی اغلاط سے پاک ہے۔ بلکہ بعض محاورے اور ضرب المثال جو معروف اہلِ قلم بھی غلط استعمال کرتے ہیں مقبول صاحب نے صحیح برتے ہیں۔''

اسی طرح ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس خودنوشت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

''مقبول صاحب نے طویل خودنوشت لکھنے سے اجتناب کیا ہے۔ بلکہ اپنے حالات، مشاہدات اور تجربات کچھ اوپر ایک سو صفحات میں تمام کر دیئے ہیں، اور حق یہ ہے کہ واقعات ایسے انداز میں لکھے ہیں کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے۔''

لیکن میں نے اس کتاب کو نہ صرف دلچسپ، خوشگوار اور انبساط انگیز پایا بلکہ ایک راہنمائی کرنے والی تصنیف بھی پائی۔



شاہد بخاری

شاہد بخاری ایڈووکیٹ 18 دسمبر 1949ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے GC کالج میں پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ بعدازاں بینک سروس میں چلے گئے۔ جہاں سے 2000ء میں اس لیے گولڈ ہینڈ شیک لے لیا تا کہ کسی اور پڑھے لکھے بے روزگار کو روزگار مل سکے۔ یونیورسل اسلامی اسپرانتو ایسوی ایشن کا صدر انہیں پہلے پاکستانی اسپرانتو دان علامہ منظر عباسی مرحوم نے بنایا۔ واضح رہے کہ دنیا کی سب سے آسان ترین زبان Esperanto ہے۔

ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور کے آپ ایڈیٹر ہیں۔ اخبار جہاں میں لاہور کی ادبی سرگرمیاں بھی آپ ہی ہر ہفتے باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ نو سال کی عمر میں نابینا ہو جانے والے شیخ محمد اقبال جنہوں نے نہ صرف ایم اے انگریزی کیا بلکہ Phd کی اور سرگودھا میں پڑھا رہے ہیں۔ کے تھنکرز فورم کے بھی شاہد بخاری سیکرٹری جنرل ہیں۔ 1996ء سے 2010ء تک ادب سرائے کے بھی جنرل سیکرٹری رہے۔ آج کل حلقہ ارباب سخن کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ اس کے علاوہ ''دستک'' مری کے بھی آپ قانونی مشیر ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق پاکستان رائٹرز گلڈ ہیومن ڈی ویلپ مینٹ فورم اور بزم ہم نفساں کے بھی آپ ممبر ہیں۔

روٹری انٹرنیشنل Centennia Elite کے آپ President رہ چکے ہیں۔

شاہد بخاری

D-601، فیصل ٹاؤن، لاہور

حال اور ماضی کی دلکش کتاب

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی اتنی دل چسپ سرگزشت ہے کہ یہ ضخیم کتاب میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ چیف ایڈیٹر ماہ نامہ ادب لطیف کی بدولت مجھے زندگی کے ہر قسم کے تجربات پر مشتمل یہ خودنوشت جس پر میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اسے پڑھنے کے بعد مرزا ہادیؒ رسوا کا یہ شعر یاد آتا رہا جو میں نے 1968ء میں B.A کا امتحان دینے کے بعد ان کے مشہور زمانہ ناول امراؤ جان میں پڑھا تھا کہ:

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ آپ بیتی کئی سالوں پر محیط قصہ امروز ہوتی ہے۔ یہ پے در پے گزری ہوئی ''آج'' کی صورت احوال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جو فرضی یا خیالی نہیں ہے۔ یہ اس دن سے شروع ہوتی ہے جب اس کے لکھنے والے نے دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ ملک مقبول احمد صاحب کی سوانح کے بارے میں لکھنے سے قبل دوسرے مصرعے کے تصرف پر معذرت خواہ ہوں:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں مقبول احمد کی

''سفر جاری ہے'' منفرد ناشر و تاجر ملک مقبول احمد کی آپ بیتی یا جگ بیتی ہے جو انہوں نے 77 سال کی عمر میں لکھ کر نئی نسل پر احسان کیا ہے جو راتوں رات لکھ پتی بننے کے صرف خواب دیکھتی ہے۔ عملی جدوجہد کو نہیں اپناتی بلکہ تعویذ گنڈوں وغیرہ کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے۔ مقبول احمد متوسط درجے کے کاشت کار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مدرس بنے۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' ''نئے زاویئے'' نکالے۔ ''بستان ادب'' اشاعتی ادارہ بھی بنایا۔ انہوں نے 1956ء میں ادارہ مقبول اکیڈمی قائم کیا۔ جو ان کی محنت و دیانت کی بدولت اپنی مثال آپ ہے۔

انسانی زندگی تلخ وشیریں داستانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ داستانیں کتاب زندگی میں درج ہوتی ہیں۔ اس کتاب کے ہر باب میں ایک سے ایک انوکھی داستان ہے۔ ہر باب کا نیا عنوان ہے۔ اخلاص و محبت، شادمانی و پریشانی، فتح و شکست، نشیب و فراز، سکھ دکھ، مسرت و انبساط، بے حسی و بے عملی، غربت و افلاس، نرم و گرم، یادیں اور باتیں، خودی و بے خودی، حیرت و استعجاب...... سب ہی کچھ اس میں موجود ہے۔ اس میں بہت سے واقعات آگے پیچھے ہیں۔ اور چند پیچھے آگے۔ اس طرح اس میں بہت سے مناظر اس طرح بدلتے چلے گئے جیسے فلم کے مناظر بدلتے ہیں۔ المختصر:

ترجماں ہے حال اور ماضی کی یہ دل کش کتاب
زندگی کے نقش ابھرے اس حسیں تصویر میں
''سفر جاری'' اس طرح مقبول احمد نے لکھی
اک اضافہ ہو گیا ہے، دل نشیں تحریر میں

یہ مفید عام کتاب ہر لائبریری کی زینت ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین اس سے استفادہ کرسکیں۔

گوہر ملسیانی

مشرقی پنجاب میں تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں ''ملسیان'' ایک دور افتادہ گم نام سا دیہات ہے لیکن اُردو اَدب میں اس کو شہرت دوام سے جناب جوش ملسیانی اور جناب عرش ملسیانی نے سرفراز کیا۔ ادب کے اس شہرت یافتہ گاؤں میں ایک فطری ادیب اور شاعر 15 جولائی 1934ء کو چودھری صدر الدین کے گھر پیدا ہوا جو علاقے کے نامور زمیندار تھے۔ وہ 1947ء میں ہجرت کر کے پہلے منٹگمری (اب ساہیوال) آئے لیکن پھر مستقل قیام رحیم یار خان میں کیا۔ یہیں ان کے بیٹے نے سکول کی تعلیم دبیر الملک نقوی احمد پوری سے حاصل کی جنہوں نے یہیں کے باطن سے شاعر کو بیدار کر دیا۔ اب وہ اَدبی دنیا میں گوہر ملسیانی کے نام سے معروف ہیں، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان میں ملسیان کی پہچان میں جناب جوشؔ اور عرشؔ صاحب کے ساتھ شامل ہیں۔

جناب گوہر ملسیانیؔ کا مزاج دینی ہے۔ انہوں نے رزق حلال حاصل کرنے کے لیے درس وتدریس کا شعبہ اختیار کیا اور پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں ایم اے، ایم فل تک ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے ساتھ ہی اَدب کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ ''جلتی رتوں کی یاد'' کے نام سے شائع ہوا۔ نعت کے تین مجموعے ''مظہر نور''، ''متاع شوق'' اور ''جذبات شوق'' چھپ چکے ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں میں ''تنقید و تحقیق''، ''اقبال علامہ اقبال کیسے بنے؟''، ''انتخاب کلام شکیل بدایونی''، ''عصر حاضر کے نعت گو''، ''انتخاب نظم وغزل''، ''کاروان جہاں''، ''غم اعلیٰ''، ''مجموعہ منظومات'' ''شوق شہادت زندہ ہے؟''، ''کاروانِ خیال'' اور سفر نامہ ''حرمین شریفین کی فضاؤں میں'' شامل ہیں۔ بچوں کے لیے انہوں نے نو کتابیں لکھیں ان میں سے ''اقبال کی نظمیں'' مقبول اکیڈمی سے چھپ چکی ہیں۔ گوہر ملسیانی کا خاص میدان نعت ہے۔ وہ سماجی اور تہذیبی مسائل پر ''نوائے وقت'' ملتان میں کالم لکھتے ہیں۔ اور پاکستان کے محب وطن دانشوروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجھے بے پایاں خوشی ہے کہ جناب گوہر ملسیانی میری اس کتاب میں شرکت فرما رہے ہیں۔



گوہر ملسیانی

62۔مدینہ ٹاؤن خانیوال

سفر جاری ہے۔۔۔۔

محبت و محنت کی زنبیل

کتابِ زندگی کے اوراقِ پارینہ کا مطالعہ کرتا ہوں تو ان میں ایک ایسا چمکتا دمکتا نگینہ پاتا ہوں، جس کی رعنائی میں حسنِ صداقت بھی ہے، رنگ نفاست بھی بلکہ یہ کہوں تو اس میں بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس میں قوتِ برداشت بھی ہے۔ یہ 1989ء یا 1983ء کا زمانہ ہے اور میرا یہ تعلیمی انتظامیہ کا عہد مخلصانہ ہے جب میرا رابطہ و تعلق مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور سے ہوا۔ مجھے اپنے علاقے کے نئے اجراء ہونے والے پرائمری اور اپ گریڈ ہونے والے مڈل مدارس کو لائبریری کتب فراہم کرنا تھی۔ ٹینڈرز کا مرحلہ گزرا تو کتب کی فراہمی کے لیے مقبول اکیڈمی کا ٹینڈر منظور ہوا۔ رابطے کے لیے ان کا ایک نمائندہ آتا رہا مگر مقبول اکیڈمی کے مالک ملک مقبول احمد سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ انہی دنوں میری ایک کتاب شائع ہوئی تھی جسے کسی اور ادارے نے طبع کیا تھا۔ میں نے اسے بھی کتب کی فہرست میں شامل کر دیا۔ مقبول اکیڈمی نے اپنی کتب پر زیادہ کمیشن دیا تھا۔ جب سپلائی کا وقت آیا تو اس پبلشر نے اتنا کمیشن دینے سے انکار کر دیا چنانچہ مقبول اکیڈمی کو کم کمیشن پر کتاب خرید کر مہیا کرنا پڑی اور نقصان اُٹھایا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب تقریباً ایک سال بعد میں اپنی ایک اور کتاب کی اشاعت

کے سلسلہ میں مقبول اکیڈمی میں گیا۔ یہ جناب ملک صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ''سفر جاری ہے'' میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ بے حد خندہ پیشانی سے اور کسی پر تہمت غائد کیے بغیر کیا گیا ہے۔

''سفر جاری ہے'' جنوری 2007ء میں اشاعت پذیر ہوئی، میں نے اس پر تبصرہ ایک اخبار میں پڑھا انہی ایام میں میری ایک اور کتاب ایک اُردو بازار کے پبلشر شائع کر رہے تھے۔ میں نے صادق آباد سے فون پر انہیں یہ کتاب خرید کر ارسال کرنے کی درخواست کی، چند دنوں بعد وہ پہنچ گئی۔ ابھی ورق گردانی ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک مقالہ کی تکمیل پر مصروف ہونا پڑا۔ یوں ''سفر جاری ہے'' کا مطالعہ التوا میں پڑا رہا۔ 2008ء میں برطانیہ جانے کا پروگرام بنا تو ویزا کے حصول کے لیے لاہور آیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مقبول اکیڈمی نے میری کتاب ''بچوں کا اقبال'' شائع کر دی ہے۔ مگر مجھے اس کی اطلاع نہ تھی۔ مقبول اکیڈمی پر پہنچا تو ملک صاحب موجود پائے۔ ملاقات پر میں نے شکوہ کیا تو ملک مقبول احمد حیران ہوئے مگر ہنستے ہوئے فوراً مجھے اس کی دس کاپیاں عنائت فرمائیں۔ گفتگو کے دوران ہی میں ''سفر جاری ہے'' کا ذکر آیا تو تدبر و تحیر سے ملازم سے کہا کہ وہ ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' دونوں کتابیں لائے۔ یہ کتب مجھے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''سفر جاری ہے'' پر اپنی رائے کا اظہار کیجئے انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں اسے شامل کر لیا جائے گا۔ یہ ہے ان کا خلوص اور عجز و نیاز اور اپنی تساہلی کا اظہار و خمیازہ، ایسی محبت سے لبریز باتیں ''سفر جاری ہے'' کا حصہ ہیں۔

میرا شوق آوارگی یا شوقِ مشاہدۂ حسن فطرت کہیے کہ میں جولائی 2008ء میں برطانیہ چلا گیا اور اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ تقریباً چھ ماہ بعد واپس آیا تو دیگر منصوبوں کی تکمیل اور طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ''سفر جاری ہے'' مطالعہ کی ذیل میں نہ آ سکی مگر مجھے وعدہ فراموش نہ ہوا۔ کتاب دیکھتا تو ملک مقبول احمد کا عارضِ گلگونہ سامنے آ جاتا اور

مجھے عہد کی تکمیل کا پیغام سنا جاتا۔ اپریل 2009ء کے آخری عشرے میں لاہور کا پروگرام بنا تو ''سفر جاری ہے'' میرا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ مطالعہ نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ دونوں کتب پڑھنے کے بعد چند سطور میں اپنی رائے کا اظہار کر کے منافقت کے دائرے سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں کیوں کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس میں وعدہ کا پاس نہیں وہ منافق ہے۔

''سفر جاری ہے'' کا آغاز تو حقیقتاً صفحہ 51 سے ہوتا ہے۔ اس کے پہلے پچاس صفحات مشاہیر دانشوروں اور ادبا کا اعترافِ عظمت ہے، ان تحریروں میں جمال محبت اور حسن حکمت ہے۔ ان میں ملک مقبول احمد کی صداقت، شرافت اور شبانہ روز محنت کی رفعت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مصدقہ اثاثہ ہے جو ملک صاحب کی زندگی کے عظیم لمحوں کی گواہی دیتا ہے۔ جب ''سفر جاری ہے'' کے حقیقی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں حیاتِ مستعار میں پیش آمدہ نشیب و فراز کی ترجمانی ہے اور زندگی کے بیتے لمحوں کی ضوفشانی ہے۔ ان میں حاسدوں کی مکروہ چالوں کی پردہ پوشی بھی ہے اور دوستوں، ''یارانِ غار'' کے حسن سلوک کی مینائیں بھی ہیں۔

آپ بیتی یا سوانح عمری، بیتے دنوں یا گزرے ماہ و سال کی ایسی کہانی ہوتی ہے، جس کی یاد تلخ لمحوں سے سبق حاصل کرنے کی جانب مائل کرتی ہے۔ شاداب موسموں پر اترانے سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ اگر آپ ان آپ بیتیوں پر عمیق نظر ڈالیں تو ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است کے مصداق مختلف طبائع، مختلف واقعات و حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ آپ بیتی اس لیے زیادہ مطالعہ میں آتی ہے کہ قاری زندگی کے ہر موڑ پر ظاہر ہونے والے نتائج کو سمجھے اور اپنے مستقبل کو سنوارے۔ اس زیر تبصرہ آپ بیتی کا ہر موڑ ایسی کسر نہیں بکھیرتا ہے جو زندگی کی تاریکیوں کو بھگانے کا عمل تیز کرتا ہے۔ اس میں صداقت کے وہ گہر ہائے گرانمایہ ہیں جو ہر انسان کی تمناؤں کا

مرکز ہیں۔

شنید میں تو یہی آتا ہے کہ آپ بیتی حقائق پر مبنی ہوتی ہے مگر یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض سوانح عمریوں میں حقائق کے اظہار سے روگردانی بھی کی گئی ہے۔ مصنف نے اپنی خامیوں، غلط کاریوں اور ناکامیوں کو پنہاں رکھا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں حقانیت کے غنچے چٹکتے ہیں اور صداقت کی بادِ بہاری خرام ہے۔ یہ آپ بیتی تو ایک جگ بیتی ہے، جس کے کردار چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ سچ جانیے یہ کئی ''سیلف میڈ'' انسانوں کی آپ بیتی ہے بلکہ میں بہانگ دہل کہتا ہوں یہ میری آپ بیتی ہے۔ صرف ایک اشارہ درج کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ راقم میٹرک تک سرکاری تعلیمی ادارے کا طالب رہا، باقی اعلیٰ مدارج بذریعہ ٹھنڈا لائن طے کیے، ''سیلف میڈ'' ہونے کے ناطے اپنی محنت اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس زندگی کی معراج پانے کے قابل ہوا۔ یہی جہدِ مسلسل، منزل کی چاہت اور جرأت رندانہ ملک صاحب کو جولانی عطا کرتی رہی۔ ملک مقبول احمد کے ہاں توکل علی اللہ کی چاشنی اور ہر قدم پر رب کائنات کی مہربانی گل خنداں کی طرح مہکتی ملتی ہے۔ نامساعد حالات میں ان کے صبر و قناعت کی فراوانی، خیالات مصفا کی درخشانی اور جذبہ مسلمانی ان پر ہونے والے تیروں کی بارش میں ڈھال بنتی ہے۔ بلند حوصلہ، اولوالعزمی اور محنت شاقہ وہ ہتھیار ہیں، جن سے ملک صاحب نے ہر طغیانی میں نصرت پائی اور اپنی پریشانی کے تدارک میں جولانی حاصل کی۔

زبان و بیان اگرچہ رمز و کنایہ، تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع کی خوبیوں سے پرتاثیر اور حسین و جمیل بنتے ہیں، لیکن جو حسن سادگی و پرکاری میں ہے وہ بھی مسحور کن ہوتا ہے۔ ملک مقبول احمد نے سینکڑوں کتب کی مفاہیم اور اسالیب کو ان کی معنوی اور صوری حسن سے جانچا اور تولا ہے۔ ان کا اندازِ بیان اپنا انداز بیان ہے۔ انہوں نے اپنے دل

کی بات، اپنے سادہ اور موثر الفاظ میں بیان کر کے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ قاری کتاب کا مطالعہ شروع کرتا ہے، اس میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر کتاب کو ختم کر ڈالتا ہے۔

خوش قسمت ہیں ملک مقبول احمد، جن کی ذریت نے علم کی کمی کے دریا کو پاٹ کر اپنے محترم و مکرم والد کی آرزوؤں کے چراغ جلا کر روشنی پھیلائی ہے۔ اپنی وسعت علمی اور معراج آگہی سے ایک سدا بہار گلشن مہکار دیا ہے۔ خوش قسمت ہیں ملک مقبول احمد جنہوں نے اپنے فرزندانِ ارجمند اور دختر نیک اختر کی عزت وعظمت اور محبت وماٗدت کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ خوش قسمت ہیں ملک مقبول احمد جن کے پوتے، پوتیوں اور نواسیوں کی معصومانہ اور وطہرانہ خواہشات نے ان سے ''سفر جاری ہے'' جیسی پُر کیف اور پُر تاثیر آپ بیتی لکھوا ڈالی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ گلستاں سدا الہلہاتا رہے۔

راہِ حیات پر چلیں سب سوچ کر یہاں — بیٹا ہو یا ہو بیٹی، سب آنکھوں کا نور ہیں
لعل و گہر ہیں گھر کے، سکوں میں قرار ہیں — ماں باپ کی بہار ہیں دل کا سرور ہیں

میں ملک مقبول احمد کو اس ''زنبیل'' کو منصہ شہود پر لانے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان اشعار پر اپنی کج مج تحریر کو سمیٹتا ہوں۔

راتوں کے اندھیارے میں تو دیا جلائے رکھ — گم کردہ منزل کو گو ہر راہ دکھائے رکھا
زخمی زخمی ہے جو انساں اپنوں ہی کے ہاتھوں — اس کو اپنی آنکھوں کا نور بنائے رکھ
جس سے ہر انساں ہو شاداں سوچوں میں ہو خوشبو — گلشن گلشن ایسے دل کش پھول کھلائے رکھ



پروین طارق

معراج پروین جن کا قلمی نام پروین طارق ہے، اردو ادب کی پہلی صاحب کتاب انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''بولتے سناٹے'' 2002ء میں شائع ہوا تھا، دوسرا مجموعہ ''دریچہء دل'' ہے، اس کا پیش لفظ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے۔ پروین طارق 18 ستمبر 1940ء کو شملہ (بھارت) میں پیدا ہوئیں، آپ کے والد شیخ محمد ابراہیم GHQ دہلی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ تشکیل پاکستان کے بعد اُن کا خاندان ہجرت کر کے راولپنڈی آ گیا۔ جہاں انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1992ء میں ایم اے کرنے کے بعد ان کی تقرری بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج برائے خواتین جھنگیہ مکھیانہ ہوگئی۔ شادی کے بعد انہوں نے ملازمت ترک کر دی، اور اپنے شوہر بیرسٹر نذیر علی طارق کے ساتھ چھ سال لندن مقیم رہیں۔ پاکستان لوٹنے پر ان کے شوہر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے تو انہیں دوبارہ خود کفیل ہونے کے لئے درس وتدریس کے پیشہ سے منسلک ہونا پڑا۔ بالآخر پوسٹ گریجویٹ مرگلہ کالج برائے خواتین ایف سیون فور سے بطور پروفیسر ریٹائر ہوئیں۔ 1982ء میں شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی تنہائی کو انشائیہ نگاری میں منہمک ہو کر پر کرنے کی کوشش کی ان کا پہلا انشائیہ ''آواز'' پروفیسر جمیل آذر نے سنا تو اول درجے کے پاس مارکس دیئے، اُس کے بعد وہ باقاعدہ انشائیہ نگاری کرنے لگیں۔ ان کے انشائیے پاکستان کے ممتاز ادبی جرائد اوراق، ادبیات، تخلیق اور دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ انشائی اسلوب کا حاصل ہے۔



پروین طارق
راولپنڈی

سفر جاری ہے

پروین طارق کو اُردو ادب کی حد تک پہلی صاحبِ کتاب انشائیہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''بولتے سناٹے'' 2002ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصہء شہود پر آیا تو اُنہیں ادبی حلقوں سے بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُن کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ''دریچہ دل'' کتابت کے مراحل سے گزر کر جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

آپ نہ صرف ایک ادیبہ ہیں بلکہ نقاد بھی ہیں۔ اَدبی کتابوں پر آپ کے تبصرے اور تنقیدی اور شخصی مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ ایک معلّمہ ہیں اور پیشہ معلّمی کو اپنی محنت سے باوقار بنایا اور درس وتدریس عبادت سمجھ کر کرتی رہی ہیں۔

اصل نام:۔ معراج پروین ہے لیکن اَدبی شناخت کے لئے اُنہوں نے اپنا نام پروین طارق رکھ لیا۔

18 ستمبر 1940ء کو شملہ (ایسٹ انڈیا) لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ محمد ابراہیم G.H.Q دہلی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ لہٰذا تشکیلِ پاکستان کے بعد اُن کا خاندان ہجرت کر کے راولپنڈی آ گیا۔

پروین طارق کی ابتدائی تعلیم دہلی St thomas High School New Delhi اشروع ہوئی، اور راولپنڈی پہنچ کر انہیں St therose High School Presation Branch میں داخل کرایا گیا جہاں سے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کرنے کے بعد امتحانات ایف اے اور بی۔اے گورنمنٹ کالج برائے خواتین مری روڈ راولپنڈی سے پاس کئے ایم اے اُردو پنجاب یونیورسٹی گورڈن کالج راولپنڈی سے 1992ء میں پاس کیا۔ جلد ہی اُن کی تقرری بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج برائے خواتین جھنگ مگھیانہ ہوگئی ۔ جہاں اُنہیں ادب شناسی کے مواقع حاصل ہوئے۔

تقریباً ڈھائی سال بعد اُن کا تبادلہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین اٹک (کیمبل پور) ہوگیا۔ اس طرح نوزائیدہ کالجز کے ابتدائی مراحل میں پرنسپلز کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے جس نے اُن میں خوداعتمادی پیدا کردی۔

یہ وہ دور تھا جب خواتین کا پروفیشنل ہونا اتنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، لہٰذا اپنے شوہر بیرسٹر نذیر علی طارق کے ساتھ لندن 6 سال مقیم رہیں۔ جہاں اُنہوں نے نیشنل بینک آف پاکستان لندن برانچ اور نیشنل شپنگ کارپوریشن لندن as a typist بطور ٹائپسٹ کام کیا۔ دیارِ غیر میں ایک بیٹی کے ساتھ اَدبی کتابیں پڑھنا اُن کا مشغلہ رہا۔

پاکستان لوٹنے پر اُن کے شوہر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرماگئے تو اُنہیں دوبارہ خود کفیل ہونے کے لئے درس وتدریس کے پیشہ سے منسلک ہونا پڑا۔

پڑھائی کے دوران والد کا انتقال اور شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد شوہر کے انتقال نے اُن کی زندگی کو شبانہ روز محنت و مشقت سے دوچار کر ڈالا لیکن اُنہوں نے

زندگی کی ان اٹل حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے صبر واستقامت کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا، اور ایک طویل عرصہ تک مینٹل گورنمنٹ کالجز اسلام آباد کے اداروں کے ساتھ منسلک رہیں۔ بالآخر پوسٹ گریجویٹ مرگلہ کالج برائے خواتین ایف سیون فور سے بطور پروفیسر ریٹائر ہوئیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کی مداح تو وہ اُن کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''اردو ادب میں طنز ومزاح'' پڑھنے کے بعد سے ہوئی تھیں۔ بعدازاں 1982ء میں شوہر کی وفات کے بعد جب وہ دوبارہ درس وتدریس سے وابستہ ہوئیں تو ''انشائیہ نگاری'' کی طرف راغب ہوئیں۔ اپنا پہلا انشائیہ ''آواز'' محترم پروفیسر جمیل آذر کو سنانے کے بعد وہ باقاعدہ انشائیہ نگاری کرنے لگیں۔ یوں ان کے انشائیے پاکستان کے ممتاز ادبی جرائد، اوراق، ادبیات، تخلیقی ادب اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ آج کل اُن کے انشائیہ ہمسایہ ملک کے رسائل میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔

اپنی سروس کے دوران ہمیشہ کالج میگزین کی ادارت کی ذمہ داری انہی کو سونپی گئی۔ اس طرح طالبات کے مضامین کی نوک پلک درست کرنے کا کام نہایت خوش اسلوبی اور لگن سے ادا کرتی رہی ہیں۔ اپنی دونوں بیٹیوں کی اعلیٰ تعلیم، تربیت اور ان کی شادیوں کے بعد آپ اپنے فرصت اور تنہائی کے لمحات میں اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتی ہیں۔

محترم جمیل آذر نے ''سفر جاری ہے'' کا ذکر کیا اور ماہنامہ زاویہ اُردو اکیڈمی ٹونڈ سویڈن میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر رشید امجد کا ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں تعارف پڑھا تو مقبول صاحب کی سوانح حیات پڑھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ اُنہیں فون کیا تو انہوں نے نہایت فراخدلی اور اپنائیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی دونوں کتابیں فوراً

بھیج دیں۔ جسے پڑھ کر ایک سچے کھرے انسان کے پیکر کا تصور ذہن میں اُبھر آیا۔

ایک اچھی ادبی کتاب کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کے ذہن و دل کو پڑھتے ہی فوراً اپنی گرفت میں کرلے۔ ''سفر جاری ہے'' ایک دلچسپ سوانح عمری ہے۔ جو پڑھنے والے کو نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔

''سفر جاری ہے''

ایک سادہ منش انسان کی داستانِ حیات ہے۔

ایک ایسی روداد ہے جسے پڑھ کر یہ احساس دل میں جاگزیں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک مقبول صاحب کی صحت اور عمر میں مزید اضافہ فرمائے اور علم و ادب کی خدمت میں اسی طرح سرگرم عمل رہیں۔

ایک ایسا انسان جس نے غیر رسمی مطالبہ و مشاہدہ، جدو جہد سعی مسلسل سے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت جس میں خالصتاً مومنانہ صفات کا عمل دخل ہے۔ وہ رسول ﷺ سے سچی محبت اور عقیدت اُن کی ذات پر کامل بھروسہ نے اُن میں خلوص نیت، خلوصِ طبیعت اور خلوصِ کار جیسی کیفیتیں پیدا کردیں یہ ایسے روشن چراغ ہیں۔ جس نے آنے والی نوجوان نسلوں کے لئے منزلوں کو روشن کردیا ہے۔ زندگی کو برتنے کے لئے ملک مقبول صاحب نے عاجزی و انکساری کی راہ اختیار کی کامیابی کے بعد بھی تفاخر کا شائبہ تک اُن کی شخصیت میں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اُن کی نیک نیتی کا سبب ہے کہ ہر کس و ناکس کے ساتھ یکساں پیار و محبت سے پیش آتے ہیں۔ جس نے اُن کے آئینہ دل کو گردِ کدورت سے پاک کرڈالا ہے۔

اُن کی والدہ جنہیں وہ بے جی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے وہ اُن کی زندگی کا ایک روشن مینارہ تھیں مقبول صاحب کو بے جی سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ دیکھا گیا

ہے کہ دنیا میں جتنی قابل قدر ہستیاں گزری ہیں اُنہوں نے اپنے بزرگوں اور والدین خاص طور پر ماں کی بہت عزت اور خدمت کی جن کے عوض رب العزت نے اُنہیں کامیابیوں سے نوازا۔ بے جی نے اپنے بیٹے ملک مقبول کو ہمیشہ یہ دعا دی۔

''اللہ کریم تمہاری منزلیں آساں کرے تمہیں دین و دنیا کی دولتیں اتنی دے کہ تم سمیٹ نہ سکو۔''

مجھے اُن کی شخصیت کے جس پہلو نے زیادہ متاثر کیا وہ یہ کہ ہمیشہ کچھ کرنے اور بننے کی سچی لگن تھی جو شعلہ جوالہ بن کر ہمیشہ ان کے نہاں خانہ دل میں سلگتی رہی۔

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں، عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔

''میری ملازمت کا سلسلہ جاری تھا۔ میری منزل کلوئے اور پرائمری سکول کی معلّمی نہیں ہے کوئی بڑا کام کرنے کی لگن نے مجھے ہمیشہ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، اس دور میں مجھے علامہ اقبال نے بہت سہارا دیا۔ مجھے اُن کا بہت سا کلام زبانی یاد تھا۔ اس طرح مجھے اُن کے نظریات سے بھی خاصی واقفیت تھی میں سائیکل پر روزمرہ کا سفر کرتے ہوئے اور ارد گرد تنہائی پا کر اقبال کی نظمیں اور غزلیں اُونچی آواز میں ترنم سے گایا کرتا تھا جس سے مجھے نہ صرف ایک گونہ سکون ملتا اور حوصلہ اور عزم بھی ملتا۔ ایک شعر کو تو میں نے حرز جاں بنا رکھا تھا۔ جہاں کہیں مجھے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے چڑھائی چڑھنا یا کوئی گڑھا عبور کرنا پڑتا تو میں پنڈلیوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے زور سے اپنے آپ کو خطاب کرتا۔

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اپنی پل پل کی بے چینی اور اضطراب کا حال تنہائی میں والدہ کا جسم دباتے

ہوئے بیان کرتا۔ تو وہ نیک دل خاتون اُنہیں دعاؤں سے نوازتیں، یقیناً یہ اُن دعاؤں اور سچی لگن اور کچھ کرنے کا شوق تھا جس نے اُنہیں کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازا۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''سفر جاری ہے''

''گوناگوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس دور کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظرنامہ بن گئی ہے۔ جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔''

اسلوبِ بیان کی سادگی اور پرکاری میں ایک ادبی حسن، لطیف چاشنی اور گسوٹ ہے۔ تصنع و تکلف سے مبرا، صداقت اور سچائی سے واقعات کے بیان نے قاری کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر اُردو کی نمایاں آپ بیتیوں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔



دردانہ نوشین خان

دُردانہ نوشین خان کا تعلق جنوبی پنجاب کے دریائے چناب کے کنارے آباد شہر مظفر گڑھ سے ہے۔ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ زندگی کے مراحل کا مرکز رہے۔ تعلیم ایم اے انگریزی ادب اور سیاسیات ہے۔تصوف پسندی گوشہ نشینی مزاج کا حصہ ہیں۔ادبی جرائد میں لکھنا 2005ء سے شروع کیا۔اس سے قبل کراچی میں چھپنے والے ڈائجسٹ میں لکھتی رہیں اور متعدد ایوارڈ پائے نوائے وقت میں کالم لکھتی ہیں اور نظمیں بھی لکھتی ہیں۔ایک افسانوی مجموعہ ''پہلا زینہ'' ایک ناول ''اندر جال'' آ چکے ہیں۔ادبی جرائد میں لگ بھگ تیس افسانے چھپ چکے ہیں۔جن کا مجموعہ زیر طباعت ہے۔



دردانہ نوشین خان
داؤیز شیلری گارڈن روڈ، مظفر گڑھ

مقبول احمد کی مقبول عام کتاب
''سفر جاری ہے''

یادیں اپنے لئے تو سرمایہ ہوتی ہی ہیں مگر یہ پرایہ اظہار کی جادوگری ہوتی ہے کہ قاری کو ان میں شریک کر دیتی ہے۔ سفر تو نام ہی جاری اَمر کا ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ اگر کسی کو پرکھنا ہو تو اس کے ساتھ مسافرت کر کے دیکھ لو۔

ملک مقبول احمد کے جاری سفر کی مطالعاتی مسافرت نے اُن کی شخصی قد و قامت کا خوب تعارف کرایا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک خوش بیان داستان گو کی صفات کے حامل بھی ہیں۔ اوائل عمری کا زمانہ اُجلی آنکھوں سے دیکھا جانے والا دور ہوتا ہے لہٰذا اس میں کہیں میل نظر نہیں آتا۔ مگر مقبول احمد نے اوائل عمری کو پختہ کار جہت سے دیکھتے ہوئے اس دور کی بھی بے ریا منظر کاری کی ہے۔ یہاں گاؤں کے ساون کی رعنائی میں زرد مینڈک، چوہے، سانپ، کن کھجورے اور بچھو بھی کچے فرش پر چلتے دکھائی دیتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ بارش کے اس سے بھی بڑے مصائب کا ذکر ہے۔ جس سے اُن کی حقیقت پسندی عیاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راستہ روکنے والی بلا کا آسیبی ماورائی تاثر ٹنڈ منڈ جھاڑی میں بدل جاتا ہے۔

اِس سفر حیات میں کچھ کردار بچپن کی کہانیوں جیسے بھی ہیں جیسے کلوئے کا اللہ ماہی

اور تھا مگر اِن میں اختراع پن کا شائبہ تک نہیں ۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ حقیقی کردار افسانوی لگیں۔

نوجوان مصنف کا علامہ اقبال کے اشعار گاتے ہوئے سائیکل سواری کرنا بلاشبہ مصفا دور کا منظر ہی ہوسکتا ہے اور دور کے مُصفا ہونے کا اقرار کرتے ہوئے مقبول احمد نے لکھا تک نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو صاحب کتاب کا ایک فقرہ روک لیتا ہے۔اُن کا کہنا ہے

''میں اگر مرعوب ہوتا تو ایسے شخص سے جو یا تو بہت پڑھا لکھا ہوتا یا صاحب کردار ہوتا یا صاحب اختیار ہوتا۔''

یہ بات اُن کی باطنی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ واقعی دنیا میں متاثر کرنے کا جائز استحقاق علم اور کردار کو ہے۔

دعا پر یقین، اسلامی کتب کی اشاعت پر اظہار مسرت، نیک نیتی، پختہ ارادہ، حج وعمرہ کی بار بار سعادت ایسے رنگ ہیں جن کی آمیزش سے باوقار، پُرعزم، سچے مسلمان کا پیکر تکمیل پاتا ہے۔ کیا خوب لکھتے ہیں۔

''میں نے کسی کام کو اپنی دسترس سے کبھی دور نہیں دیکھا''

ایسا وہی کہہ سکتا ہے جس نے علامہ اقبالؒ کو صرف پڑھا اور گایا ہی نہ ہو بلکہ کلام اقبالؒ سے اپنی روح کو سجایا اور گدرایا ہو۔

''سفر جاری ہے'' میں ناشر کے قلم سے ناول نگاروں، دانشوروں، ادیبوں اور کالم نگاروں کے قول وفعل کے دُہرے معیار کا پردہ چاک ہوتے پڑھا مگر اُنھوں نے اشارۃً بھی کسی کا نام درج کرنے سے گریز کیا۔

کتاب مذکورہ کا باب ''تندرستی ہزار نعمت ہے'' میرے ہاں چند عزیزوں میں

موضوع بحث رہا۔ ''نیا علم شفا بخشی'' کا مطالبہ مجھ سے کیا جاتا رہا۔

''حرف آخر'' تک پڑھنے کے بعد کتاب بند کرتے ہوئے میں نے بے ساختہ سوچا خوش نصیب ہے وہ انسان جو اپنا آپ اتنے آرام سے نقاشی کر سکے اور کر سکنے کے بعد سرشار و مطمئن ہو۔

دُعا ہے کہ ملک مقبول احمد کی نہ صرف ارضی حیات بلکہ مابعد دائمی مطمئن ہوں۔

''سفر جاری ہے'' ہر عمر کے قاری کے لئے ایک قابل مطالعہ عمدہ کتاب ہے۔ جناب مقبول احمد کی مقبول عام کتاب مبارک ہو۔



ایم آر شاہد

ایم آر شاہد ولد محمد دین (مرحوم) 1958ء میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب کی ایک آزاد ریاست مالیر کوٹلہ ضلع سنگرور میں پیدا ہوئے۔ تین جماعتیں اپنے آبائی علاقہ محلہ چور ماراں کے مسلم پرائمری سکول سنامی گیٹ سے پڑھیں۔ ستمبر 1969ء میں بھارت کو خیر باد کہہ کر اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ یہاں مزنگ لاہور میں سکونت اختیار کی اور ایم سی پرائمری سکول وارث روڈ لاہور میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور 1973ء میں پرائمری پاس کی۔ اب اس سکول کی جگہ بلند و بالا عمارت گورنمنٹ میاں نواز شریف گرلز کالج واقع ہے۔ میٹرک کا امتحان 1978ء میں گورنمنٹ مزنگ ہائی سکول سے پاس کیا۔

27 اپریل 1981ء میں محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ ادبی سرگرمیوں کا آغاز اس سے قبل شروع کر چکے تھے۔ پھر ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے علمی، ادبی ذوق کی تشکیل کے لئے ادبی حلقوں سے منسلک رہے اردو اور پنجابی میں مختلف قومی اخبارات و ادبی جرائد میں مضامین، فیچر، انٹرویو اور دیگر تحریریں لکھنے کا سلسلہ جو تا حال جاری ہے۔ ستمبر 2003ء میں پہلی تحقیقی کتاب لاہور میں مدفون مشاہیر جو لاہور کے ایک سو پانچ قبرستانوں کی تحقیق پر مبنی ہے شائع ہوئی دوسری تحقیقی کتاب جولائی 2004ء شہر خموشاں کے مکیں جو اسلام آباد، راولپنڈی (ڈویژن) میں زمین کی آغوش میں سوئی نامور ہستیوں کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب فروری 2006ء شہیدان وطن کے نام سے آئی اس میں شہداء وطن کے حالات زندگی شامل ہیں۔ مرکز علم و فن کے چیئر مین کے علاوہ ملک کی بہت سی تنظیموں کے رکن اور عہدیدار ہیں۔ ان کی نظریں پورے پاکستان کی سرزمین میں آسودہ خاک خوبصورت ہستیوں کی تحقیق پر جمی ہیں۔

نامور صحافی، دانشور، ترقی پسند مصنف عبداللہ ملک کی چھ تصانیف مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔



ایم۔آر۔شاہد

چیئرمین مرکزِ علم وفن، 12 پنج محل روڈ۔لاہور

18-11-2009

جناب ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم!

آپ کی علمی، ادبی اور اشاعتی خدمات کے بارے میں کون نہیں جانتا...... میں چند الفاظ لکھ کر بھلا اس میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔آپ کی تینوں تصانیف (۱) سفر جاری ہے (۲) پذیرائی (۳) اہل قلم کے خطوط میرے قریبی دوست جناب عبدالستار عاصم کی معرفت موصول ہوئیں۔انھیں میں مصروفیات کے باعث مکمل تو نہیں پڑھ سکا۔مگر مثل مشہور ہے کہ دیگ کا ایک دانہ چکھنے سے پوری دیگ کا پتہ چل جاتا ہے۔

سچ پوچھیئے! تو یہ آپ کی ''آپ بیتی'' پر مبنی تینوں تصانیف اپنی مثال آپ اور یہ کتابیں اپنی نوعیت کی منفرد اور دلکش تحریریں ہیں۔یہ آنے والی نئی نسل کے لئے تحریک بھی ہے اور تاریخ بھی۔کیونکہ آج کی تحریر...... کل کی تاریخ ہے۔ایسا کام کرنے والی شخصیات تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔میرے بھائی! عبدالستار عاصم کا اصرار تھا کہ ان کتابوں کو صرف پڑھنا ہی نہیں...... بلکہ ان پر اپنے تاثرات بھی تحریر کرنے ہیں۔اتنی بڑی قد آور شخصیت کے متعلق اپنی رائے قلمبند کرنا یہ میرے لیے مشکل کام تھا۔سو آپ کی محبت نے وہ کام کر دکھایا۔خیر! یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں آپ کی تحریروں کے بارے میں اپنے ٹوٹے ہوئے الفاظ کا حصہ ڈال رہا ہوں......

ہماری علمی، ادبی اور اشاعتی دنیا میں بہت کم کم ہوا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت ایک اچھا پبلشر بھی ہو اور ادیب بھی۔ آپ کی محترم شخصیت میں یہ تمام خوبیاں یکساں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آپ پر خاص عنایت اور پیارے حبیب ﷺ کا صدقہ ہے۔ یہ عزت اور احترام و مقام آپ کی دنیا میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

یہ نئے اور پرانے اہل قلم کے خطوط ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ انہیں محفوظ کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ یہ خطوط رکھنے والوں میں اکثر مشاہیر زمین کی آغوش میں یہ کہتے ہوئے

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ابدی نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مگر ان کی تحریریں یادوں کی صورت میں زندہ ہیں وہ یادیں جو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

طالب دُعا

ایم۔ آر شاہد

ڈاکٹر صابر آفاقی

ڈاکٹر صابر آفاقی بنیادی طور پر ایک ماہر تعلیم ہیں اور انہوں نے اپنی خداداد تعلیمی صلاحیتوں سے آزاد کشمیر میں علم کی روشنی پھیلانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن ان کی دوسری بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک نامور ادیب، شاعر، نثر نگار اور حقیقی دانشور ہیں۔ ان کی پیدائش تحصیل مظفر آباد کے ایک گاؤں پہٹکہ میں 1933ء میں ہوئی۔ انہوں نے سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پہلے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایم اے فارسی اور ایم اے اُردو کے امتحانات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کے لیے 1972ء میں تہران یونیورسٹی گئے۔ واپس آئے تو وہ صابر آفاقی سے ڈاکٹر صابر آفاقی بن چکے تھے۔

اُردو، فارسی اور گوجری میں ان کی شاعری کے 15 مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے تمام اوّل درجے کے ادبی رسائل میں شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صابر آفاقی کو مناظر فطرت کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہے۔ اس شوق نے سیاحت کی صورت اختیار کی اور وہ 25 سے زیادہ ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ آزاد کشمیر یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہیں۔ ان کی اہم مطبوعہ کتابوں میں اقبال اور کشمیر، کشمیر اسلامی عہد میں، جلوۂ کشمیر، عکس کشمیر اور آئینۂ کشمیر شامل ہیں۔

ڈاکٹر صابر صاحب نام کے لحاظ سے آفاقی ہیں لیکن مزاج کے لحاظ سے یکسر زمینی ہیں لیکن یہ زمین شاعری کے لیے بڑی زرخیز ہے۔ اور وہ ہمہ وقت اشعار کے گلاب اگاتے رہتے اور اہل ادب سے داد وصول کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے میری کتاب "سفر جاری ہے" پڑھی تو اس پر ایک خوبصورت تبصرہ لکھا جو گلدان میں رکھے ہوئے پھولوں کے خوشبودار گلدستے کے مترادف ہے۔ میں ان کی مقبول نوازی کا ممنون ہوں۔



صابر آفاقی

سفر جاری ہے۔۔۔
ایک منفرد سرگزشت

آپ بیتی لکھنے کا رواج دنیا کی ہر زبان میں موجود رہا ہے۔ اُردو میں بھی آپ بیتی کی کمی نہیں ہے۔

جو لوگ محنت اور ذہانت سے بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں تک ان کی زندگی کی دشواریوں کا تذکرہ پہنچے اور یوں جو کام انہوں نے کیے ہیں ان کی قدردانی کی جائے۔

اس طرح ایک سرگزشت نگار دوسروں کو اپنی خوشیوں میں اور دکھوں میں شریک کرتا ہے۔ اور اپنی ذات کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر کامیاب ہوں۔

بعض اوقات آپ بیتی میں خود نمائی کا پہلو زیادہ ہوتا ہے۔ زندگی کے واقعات کو مرتب اور مؤثر طور پر قلم بند کرنا مشکل کام ہے۔

موجودہ عہد میں اُردو میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں ملک مقبول احمد کی آپ بیتی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ایک ایسا نام ہے، جس کے اندر کئی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔

انسان کئی سفر کرتا ہے اور اُسے کئی منزلیں طے کرنی ہوتیں ہیں۔ ایک سفر روح کا ہے۔ کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے۔ لیکن موت اس کی آخری منزل نہیں ہے۔ بلکہ آدمی دم لے کر آگے چلتا ہے۔ اور سفر جاری رہتا ہے۔ دوسرا سفر زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔ تیسرے سفر کے دوران انسانی اور روحانی فضائل حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور چوتھا سفر وہ ہے جس میں تکمیل ذات کے بعد انسان دوسروں کے لیے سراپا خیر بن جاتا ہے۔

اس طرح ایک نیک آدمی کا عمل اور اس کی خدمات زندہ رہتی ہیں بلکہ اولاد میں فضیل ہو کر سفر جاری رکھتی ہیں۔ ملک صاحب نے علم و ادب کے فروغ کو اپنا مشن بنایا اور کامیاب رہے۔ سفر جاری ہے میں انہوں نے زندگی کے حالات نہایت پیارے انداز میں لکھے ہیں۔ اور اس کتاب کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ ان تبصروں سے ہو جاتا ہے جو ''پذیرائی'' میں شائع ہوئے ہیں۔ میں اکیڈمی کی مطبوعات پڑھتا رہا ہوں لیکن ملک صاحب سے میرا تعارف بہت دیر میں ہوا۔

ملک صاحب نے میری تین کتابیں شائع کیں پہلے ایران کی انقلابی شاعری، قرۃ العین طاہرہ پر میری کتاب شائع ہوئی۔

دوسری کتاب اقبال اور آزادی کشمیر اور تیسری کتاب عکس کشمیر کے نام سے شائع ہوئی۔ اور چوتھی کثرت نظارہ جو میرا سفر نامہ ہے۔ اس دوران مجھے ملک صاحب کے ساتھ بیٹھے ان کی گفتگو سننے کے مواقع میسر آئے۔

ملک صاحب نہایت خوش اخلاق، خدا پرست اور بزرگوں کی پرانی روایات کے حامل ہیں۔ ان میں عام ادیبوں یا ناشروں جیسا فخر غرور نام کوئی نہیں۔ وہ جب دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں تو مخاطب کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

اس خصوصیت نے ان کو اہل قلم میں مقبول بنا دیا۔ ''سفر جاری ہے'' امید تسلسل حیات اور بقاء روح کا پیغام ہے۔

شہزاد منیر احمد

شہزاد منیر احمد 7 مئی 1946ء کو وادی جموں کشمیر کے ایک چھوٹے سے پُر امن اور خوبصورت گاؤں جگتو چک میں پیدا ہوئے۔ 1947ء میں آپ کے آباؤ اجداد دیگر راجپوت قبائل کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں آن بسے۔

اُنہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول ''اگوکی'' سے 1964ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ 16 اگست 1965ء کو پاکستان نیوی میں بھرتی ہوئے۔ 9 سال تک پاک بحریہ میں رہے جس میں ان کا 4 سال مشرقی پاکستان میں قیام بھی شامل ہے۔ اسی دوران آپ نے کراچی یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے کے ساتھ ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ قانون کی ڈگری ابھی لے نہ پائے تھے کہ 16 اگست کو پی اے ایف میں کمیشن کے لیے منتخب ہو کر پاک فضائیہ کی ٹریننگ کیلئے اکیڈمی میں چلے گئے۔

کم و بیش 27 سال پاک فضائیہ کی ایڈمنسٹریٹو برانچ میں خدمات سرانجام دینے کے بعد 8 مئی 2000ء کو 54 سال کی عمر پوری ہو جانے پر گروپ کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں انٹر سروسز گروپ میں شامل ہو کر بلوچستان چلے گئے جہاں سے دوران سروس آپ نے بین الاقوامی تعلقات (آئی آر) میں ایم اے کیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ آج کل فضائیہ کالج جناح کیمپ راولپنڈی میں بطور وائس پرنسپل خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ شہزاد منیر کی ذات کو کسی گندم کے خوشہ کی طرح خوشۂ محنت و ثمر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کے ایک ایک دانے سے نہ جانے کتنے اور اہل علم و عمل پیدا ہونا ابھی باقی ہیں۔

شہزاد منیر احمد

مکان نمبر 42 گورایہ سٹریٹ نمبر 4
عمر ٹاؤن، ڈیفنس روڈ سیالکوٹ

سفر جاری ہے

عظیم ادیب جناب ممتاز مفتی کی تراشی ہوئی اصطلاح کے مطابق میں چونکہ ''ادھ پڑھ'' ہوں اس لیے مطالعہ میں ضرورت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ میری اس کمزوری سے میرا ہر دوست خوب خوب واقف ہے۔ تاریخ، سائیکالوجی اور بائیوگرافیز کا مطالعہ پہلی ترجیح ہوتا ہے کیونکہ انسانی کردار کو تحریک بخشنے والی تحریروں میں سوانح عمری سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ لکھنے والی ساری شخصیتوں کے بقول اَدب و اخلاق اور کردار سازی کیلئے بچوں کو پرانی کتابیں پڑھانا چاہیں یا انہیں بزرگوں کے پاس بیٹھنا چاہیے۔ کنفیوشس نے بھی کہا تھا کہ اپنے بچوں کو کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں، کارخانوں کے مزدوروں سے ملوایا کرو وہ انہیں دیکھ کر بزرگوں سے سوال در سوال کر کے بہترین شہری بنیں گے۔

سفر جاری ہے مجھے جناب علامہ عبدالستار عاصم جو القلم فاؤنڈیشن کے بانی، کالم نگار اور انوارِ جمیل و خبر قبیلہ جیسی قومی شہرت یافتہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں نے بھجوائی سفر جاری ہے وصول پائی تو حسب عادت کتاب کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ورق گردانی کرتے کرتے جب میں نے مندرجہ ذیل پیراگراف پڑھا۔

بابا خیرو کی لڑکی شمی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ آنے بہانے اس کو دیکھنے کی خاطر اس کے گھر کے قریب سے گزرتا اور وہ مجھے نظر آ ہی جاتی۔ ایسے لگتا جیسے وہ بھی مجھے دیکھنا پسند کرتی ہے۔

ہمارے گھر کی کھوئی سے پانی لینے آنے والی دو سگی بہنوں کے بارے میں بھی میرے احساسات کچھ اِس قسم کے تھے۔ وہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک کا نام شہناز تھا جو بہت خوبصورت تھی دوسری بہن شمشاد اگرچہ اتنی خوبصورت نہ تھی لیکن اس میں ایک خاص نوعیت کی بڑے غضب کی کشش تھی۔ یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی کہ میرا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔''

میں بے اختیاری میں زیرلب مسکرایا۔ دل نے کہا وہ شخص جو پچھلے ساٹھ پینسٹھ سال سے اپنی معصوم محبت فطری کشش اور جذبوں کو یوں احتیاط سے محفوظ رکھے ہوئے ہے وہ غیر ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ وہ آج بھی سچا اور قابل بھروسہ انسان ہے ایسا صاف گو انسان معاشی لین دین یا معاشرتی رابطوں میں ڈنڈی مارنے والا نہیں ہوسکتا۔ جس شائستگی اور بے باکی سے اس نے اپنا بچپن کتابی شکل میں بیان کیا ہے ایسا صرف اور صرف ایک سچائی میں گوندھا بندھا شخص ہی کرسکتا ہے جس کا اندر والا انسان بہت ہی سچا ہوگا کیونکہ اندر کا انسان ہمیشہ مضبوط انسان ہوتا ہے مگر وہ باہر والے سے صرف اسی وقت مخاطب ہوکر ORIGINAL TRUTH بیان کرتا ہے جب وہ اسے قابل بھروسہ اور مضبوط پاتا ہے۔ جس طرح اللہ صرف انہیں ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔

میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی کہ ایسی کتاب یوں افرتفری میں یا صرف پڑھنے کی خاطر نہیں پڑھنی چاہیے۔ ہفتہ کی شام میں نے سفر جاری ہے پڑھنا شروع کی اور ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھی۔ اس کی وجہ اِس کتاب میں انمٹ سچائی کا عنصر ہے جو مجھے کتاب سے الگ نہیں ہونے دے رہا تھا۔

سفر جاری ہے کے مصنف ملک مقبول احمد لکھتے ہیں:

''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں، کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالوں سے انتہائی کم علم ہوں۔''

مصنف کی بظاہر کامیاب اور مطمئن زندگی کے بارے پڑھ کر اور ان کی باطنی مکمل انسانی شخصیت کا اندازہ کر کے میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی طرح بھی خسارے میں نہیں ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں سے واقعتاً صرف دستاویزات ہی عطا فرمائی جارہی ہیں علم نہیں۔

میری ایک عزیزہ بیرون ملک رہائش پذیر ہیں۔ اُن کا کنبہ سالانہ چھٹیوں کے دوران پاکستان آیا تو اُن کی سات سالہ بیٹی بھی ساتھ تھی۔ انہوں نے کہا کہ بچی کو اپنے سکول میں دوسری جماعت کی بچیوں کے ساتھ بٹھادیا کرو۔ اِس کی پڑھائی میں حرج نہ ہو۔ میں نے ایسا کر دیا۔ چوتھے دن بچی نے اپنی والدہ سے کہا میں سکول نہیں جاؤں گی۔ وجہ اس نے یہ بتائی کہ سکول میں وہ کچھ سکھاتے تو ہیں نہیں بس پڑھاتے اور لکھاتے ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم پہ اِس معصوم بچی کا تبصرہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

سفر جاری ہے پڑھ کر صدیوں پرانی سچائیوں کی تصدیق ہوتی ہوئی ملتی ہے۔ ملک مقبول احمد آٹھویں جماعت پاس کر لینے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر آگے تعلیم کا باقاعدہ تسلسل قائم نہ رکھ سکے کہ اردگرد کے کسی گاؤں میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا۔ اور دور بھیجنے کیلئے والدین راضی نہ تھے۔ انہیں پٹواری بننے کے لئے گوجرانوالہ سکول میں داخل کروادیا گیا تو وہ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح چپ چاپ وہاں چلے تو گئے مگر انہیں وہ ملازمت پسند نہ آئی تو تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس گاؤں آگئے۔ پھر پرائمری استاد کے تقرر

کا سرکاری خط مل گیا۔ یہ ملازمت بھی چھوڑ دی کہ وہ مزاج کے خلاف تھی۔ ملک صاحب کا یہ فیصلہ اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ جو شخص اپنے پیشے سے محبت نہیں کرتا وہ اس پیشے میں عروج، ترقی یا ناموری نہیں کما سکتا۔ ملک صاحب نے پبلشنگ کا پیشہ اختیار کیا۔ اس سے محبت کی اس میں محنت کی اور آج ہمہ تن ان کی عزت بھی ہے، شہرت بھی اور دل کی تسکین بھی۔ دنیا میں ہر بڑے فرد نے جس نے بھی شہرت پائی اس نے اپنے پروفیشن کو اس وقت چھوڑ دیا جب وہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
پھول وہ سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

سفر جاری ہے ملک صاحب اپنے جاری سفر میں طرح طرح کے لوگوں سے ملتے ہیں کبھی سماجی سطح پر کبھی کاروباری سلسلے میں اور کبھی صرف معاشرتی رکن ہونے کے ناطے۔ اب ظاہر ہے کہ معاشرے میں اچھے اور برے قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے ملک صاحب اپنی دانست میں ہر ملنے والے سے مناسب طریقے سے ملتے یا لین دین کرتے ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں مگر وکھری ٹائپ کے لوگوں سے ملنا ان کی بہتر کامیابی ہے۔ وہ اس لیے کہ معمولات کے عین عین چلتا اور پھر چلتے ہی رہنا اکتاہٹ اور بے دلی پیدا کرتا ہے جبکہ مخالفت مزاج یا کسی اور رکاوٹ سے نپٹنے کیلئے صلاحیتیں بھی غیر معمولی درکار ہوتی ہیں۔ دنیا کے حسن میں کشش اور رغبت تو ہے ہی کشمکش افتاد سے ہے۔ وکھری ٹائپ کے لوگوں سے تب تک کامیابی سے ڈیل نہیں کیا جا سکتا جب تک ایک اصولی اور مضبوط شخصیت، دور اندیشی، بردباری سے کام لیتے ہوئے ضابطوں کا ہتھیار چابک دستی سے استعمال

نہ کرے ملک مقبول احمد اِن وکھری ٹائپ کے لوگوں سے کامیاب معاملات کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

کسی خاوند نے اپنی عقلمند بیوی سے احمقانہ سوال کر ڈالا۔اس نے پوچھا بتاؤ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا حضرت یوسف علیہ السلام زیادہ خوبصورت تھے۔ بیوی بیچاری پریشان ہوگئی کہ ''سچ آکھاں تے بھانبڑ بلدا اے'' بیوی نے جواب دیا پہلے مجھے خوبصورتی کی تعریف کر کے بتاؤ کہ خوبصورت کسے کہتے ہیں۔ خاوند نے ایک نہ سنی اور جواب سننے کیلئے بضد رہا۔ بیوی نے اللہ سے مدد مانگی اور اسے جواب مل گیا بولی: ''شنیدہ کہ بود مانندِ دیدہ'' کہ سنا ہوا دیکھے ہوئے کے برابر نہیں ہوتا۔

ملک مقبول احمد سے میری ملاقات آج تک نہیں ہوئی۔ مذکورہ بالا جناب عبدالستار عاصم کی وساطت سے راقم نے اپنی کتاب ''زندہ آنکھیں مُردہ خواب'' ملک صاحب تک اس گزارش کے ساتھ بھجوائی کہ اگر ممکن ہوتو اسے چھاپ دیں۔ ملک صاحب نے بغیر کسی این وآں کے وہ کتاب چھاپنے کی حامی بھر لی جواب دیگر مراحل سے گزر رہی ہے یہ کہنے کا مطلب ہے کہ میں نے مقبول اکیڈمی کو ایک معاون اور خیر طلب ادارہ پایا ہے۔

میرے قریب سوانح عمریاں پڑھنے والوں کیلئے اپنے بارے فیصلہ کرنے میں بڑی معاون اور موثر معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے کہ قارئین بغیر کسی ندامت کے شرم ساری یا کوئی معاوضہ ادا کیے اپنی شخصیت میں پنہاں ناپسندیدہ معیار کی اصلاح کرے۔ یا مشکل حالات میں ہونے پر کوئی باوقار

حل تلاش کرلے کہ سوانح عمری میں شامل کچھ واقعات ایسے ہی ہوتے ہیں جو تقابلی راہیں تلاش کرے اور سودمند فیصلہ کرنے میں راہنمائی کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول صاحب کی خودنوشت ایک غیر معمولی ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک صاحب کی پہلی ادبی کاوش ہونے کے باوجود ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ ان کی زندگی کی کہانی ہے جس میں رشتوں کی چاشنی بھی ہے اور رشتوں ہی سے ملنے والی حوصلہ شکنی بھی ہے جسے پڑھ کر قاری ان کی ہمت اور کامیابی دوستوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''سفر جاری ہے'' میرے اور آپ سب کیلئے ہے جو زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ ملک مقبول صاحب کا یہ سفر جاری ہے تو اسے کامیابی سے منزل تک طے ہونا چاہیے۔ اب جب میں یہ ساری کتاب پڑھ چکا تو آخر میرے دل میں یہ سوال اب بھی مچل رہا ہے کہ ملک مقبول نے تو بقول اُن کے ادبا، شعرا، مصنفین، مترجمین، معلمین، محققین اور عالی ظرف انسانی اور کتابوں کے داخلی جمال سے فیض یاب ہو کر ایک کتاب بن گئے ہیں۔ دوسرے پبلشرز ایسا کیوں نہ کر سکے یا پھر اُن کے ہاں بھی کوئی ایسی کوشش و کردار محفوظ ہے۔

میری دعا ہے کہ ملک مقبول صاحب کا یہ خیر طلب اور علم نواز سفر جاری ہے تو جاری بھی رہے اور آسان، بے خطر و کامیاب بھی ہو۔



رئیس الدین رئیس

رئیس الدین رئیس ہندوستان کے نامور شاعر ہیں۔ وہ اتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ جو رسول اکرم نبی آخر ﷺ کے صحابی تھے۔

رئیس احمد رئیس نے 22 سال کی عمر میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول بڑا علمی اور ادبی تھا۔ رئیس الدین رئیس اُردو فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے نئی غزل کو نیا لہجہ اور نیا اسلوب عطا کیا ہے۔ وہ فن برائے زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور انہوں نے جدید اُردو غزل میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا ہے ان کی شاعری کے تین مجموعے ''آسمان حیران ہے''، ''زمین خاموش'' اور ''سمندر سوچتا ہے'' شائع ہو کر ادبی حلقوں سے داد وصول کر چکے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ ان کے علمی اور ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے۔



رئیس الدین رئیس
10/1725، دہلی گیٹ علی گڑھ-202001

بے لاگ و بیباک اور سچی خودنوشت کے خالق

ملک مقبول احمد سے اگرچہ بالمشافہ ملاقات کی سعادت کبھی نصیب نہ ہوئی اور نہ ہی کبھی مکتوب نگاری کا شرف حاصل ہوا لیکن میں انہیں بحیثیت ناشر مقبول احمد لاہور ایک مدت سے جانتا ہوں اور ان کی اشاعت گھر کی چھپی ہوئی کتابوں سے استفادے کے مواقع بھی میسر آتے رہے ہیں لیکن ان سے قربت کا گہرا احساس نقشبند قمر نقوی (امریکہ) کی وجہ سے روشن ہوا ہے کیوں کہ گزشتہ کئی سالوں سے موصوف مجھے ارسال کردہ اپنے خطوط میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرح ملک مقبول احمد کی توصیف و ستائش اور ان کی شخصی شرافت، متانت، معاونت اور سخاوت کے پہلو نمایاں کرتے ہی رہتے ہیں۔

اب دفعتاً ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' مجھے ڈاک میں موصول ہوئی تو میری حیرت اور خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اصل مسرت تو مجھے اس بات کی ہے کہ ان سے ربط وارتباط کے ساتھ ہی مجھے ان کی تصنیف پر تاثرات قلمبند کر کے ان سے قریب تر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

جہاں تک سوانح کا تعلق ہے وہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک سوانح تو ایسی

ہوتی ہے کہ زندگی اور زندگی کے واقعات تو دیگر ذات گرامی کے ہوتے مگر لکھنے والا کوئی اور شخص ہوتا ہے جیسے یادگارِ غالب حالؔی نے تصنیف کی ہے اور ڈاکٹر جانسن کے سوانح نگار بوسیلؔ ہیں لیکن جب کوئی اپنی زندگی کے واقعات بذاتِ خود قلمبند کرتا ہے تو وہ آٹو بایوگرافی یا خودنوشت کہلاتی ہے۔ مقبول صاحب نے 208 صفحات پر مشتمل جو خود نوشت لکھی تھی اس میں جب ڈاکٹر انور سدیؔد کے مشورے پر مشاہیر ادب پر تاثرات کا اضافہ کیا گیا تو یہ 455 صفحات کی ایک ضخیم کتاب بن گئی جسے سینکڑوں مشاہیرِ ادب نے سراہا اور تعریفی خطوط بھی لکھے جس سے متاثر ہو کر انہوں نے انور سدید کے مشورے سے قبل والے 208 صفحات کے مسودے کو الگ سے 208 صفحے کی کتاب کا روپ دے کر اسے بھی اجراء کر دیا۔ ان کا یہی نسخہ میرے زیر مطالعہ ہے۔

خودنوشت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اولاد ڈاکٹر ظفؔر مقبول، ڈاکٹر ارشدؔ مقبول اور اکلوتی بیٹی شہنیلاؔ وحید کے علاوہ اپنے پوتے، پوتیوں اور نواسے، نواسیوں کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور ان کا پوتا بابر مقبول جوان سے دوستوں جیسا سلوک روا رکھتا ہے اور وہ بھی اسے بے حد عزیز رکھتے ہیں کی ترغیب واصرار پر ہی انہوں نے یہ خودنوشت تحریر کی ہے۔ کتاب کے وسط میں آرٹ پیپر کے بارہ صفحات پر شائع ہوئی ان کے خاندان کی تصاویر میں ملک مقبول احمد کے علاوہ ان کے والدین ان کی اہلیہ خورشیدؔ جہاں ان کے بیٹے ظفؔر مقبول، ڈاکٹر ارشدؔ مقبول، بیٹی شہنیلاؔ وحید، داماد ڈاکٹر وحیدؔ، پوتا بابرؔ مقبول اور دیگر پوتے پوتیوں اور نواسیوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے دونوں حسین وجمیل بیٹوں اور بے حد حسین بیٹی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے فرصت میں انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ مقبولؔ صاحب شریف و نیک خدا ترس اور دریا دل انسان ہیں اور دشمنوں کو بھی سچے دل سے دعا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ

سیالکوٹ کے ایک عام سے گاؤں سے لاہور تشریف لائے اور کتابوں کی اشاعت کا پیشہ اختیار کر کے اور معیاری کتب شائع کر کے اپنے مطبع مقبول اکادمی کو شہرت دوام سے ہمکنار کیا۔ ان کی زندگی طرح طرح کی مشکلات و مصائب سے بھی دوچار رہی مگر ان سے نبرد آزمارہ کر حالات پر قابو پا کر ہی دم لیا۔ ان کی زندگی کی کہانی میں ہمیں اپنی زندگی کی نمایاں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ملک مقبول نے اگرچہ کسی کالج یا یونیورسٹی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا لیکن خاندانی تہذیب و ادب اور محبت علماء و ادباء مطالعہ کتب کے استفادے کی بنیاد پر وہ صاحب قلم بن گئے ہیں۔ ان کی نثر میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی شگفتگی بھی اور روانی بھی فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی سحر بھی ہے اور تاثیر بھی۔ ایک صاحب سحر طراز افسانہ نگار کی طرح انہوں نے اپنے گاؤں اور وسیع تالاب کے سامنے واقع اپنی حویلی گاؤں کے مرد، عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور ان کے مشاغل ان کے مزاج اور ان کی کارکردگیوں کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ انہیں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے فن میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ کردار نگاری اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے فن میں بھی بے مثل اور یکتا ہیں۔

خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات قلبی واردات، حادثات، مشاہدات، مسائل اور تجربات بغیر کسی مبالغے کے بلاکم و کاست بیان کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر تجربہ اپنی صداقت و سچائی کے سبب ہمارے اپنے تجربات سے ہمیں میل کھاتا معلوم ہو کر ہم پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔

ان کی خودنوشت متضاد و متنوع واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر ان کو مثال کے طور پر پیش کیا جائے تو ایک کتاب وجود میں آجائے گی لہٰذا اسی کے ساتھ ہی مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

معصوم شرقی

معصوم شرقی کا پیدائشی نام عبدالغفار انصاری ہے۔ آپ 4 نومبر 1948ء کو شمالی کولکتہ کے پرگنہ 24 میں پیدا ہوئے۔ ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ اب کانکی تارہ میں درس وتدریس کا فریضہ ادا کر رہے ہیں اور محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔

معصوم شرقی کی شاعری حساس دل کے افکار و تاثرات کا آئینہ ہے۔ ان کا خلوص زندگی کے بارے میں ان کا مثبت نظریہ ان کی شاعری سے جھلکتا ہے۔ اور وہ وسیع تر انسانیت کے شاعر شمار ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرتی ناہمواریوں پر طنز کے تیکھے تیر چلاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''صدائے العش'' اور ''لمحوں کے قدم'' چھپ چکے ہیں۔ ''تراشیدہ'' تنقیدی و تحقیقی مضامین کی کتاب ہے۔ انہوں نے ''اشک امرتسری'' کا حیات نامہ لکھا اور ان کے کلام کی تدوین کی ہے۔ ان کی زیر طبع کتابوں میں تاریخ ادب اور مغربی بنگال کے خصوصی پس منظر میں۔۔۔ ''بنگلہ دیش میں اردو ادب کے سو سال'' اور ''رباعیات سرمد کا تنقیدی جائزہ شامل ہیں۔

''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ آپ کی نذر ہے۔ یہ بھارت کے معروف جریدے ''انشاء'' میں شائع ہوا ہے۔



ڈاکٹر معصوم شرقی

House # 63/2, Baraipara,
P.O/R.L.B Lane,24 Pargranas
(North). Pin-743 194

''سفر جاری ہے''

شخصیت خود بخود نہیں بن جاتی بلکہ وہ بنانے سے بنتی ہے۔ اس کی تعمیر میں انتھک لگن اور جہد مسلسل کی کارفرمائی ہوا کرتی ہے اور منزلِ مقصود اسی کے مقدر میں ہوتی ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی ۷۷ سالہ زندگی کے سپید و سیاہ کی خود نوشت ہے جس میں انہوں نے زندگی کے سفر میں پیش آنے والی ذاتی مشکلات، حادثات اور اپنے شب و روز کے احوال کو شرح و بسط کے ساتھ بے کم و کاست بیان کئے ہیں۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پیشِ نظر کتاب ان کی زندگی کے سفر کی کہانی ہی نہیں بلکہ یہ ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے۔ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے لئے خوبصورت عناوین مختص ہیں۔ ابتدا میں خودنوشت کے تعلق سے ڈاکٹر صفدر محمود، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، اے حمید، قمر نقوی اور ڈاکٹر اللہ بخش ملک کے علاوہ دیگر مشاہیر ادب کے اہم مضامین ہیں۔ مقبول صاحب نے دیہی زندگی کی منظر کشی، بے فکر زندگی، لڑکپن اور عنفوان شباب کا تذکرہ جس انداز سے کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہے۔ یہ ان کے قلم اور اندازِ تحریر کا اعجاز ہے۔ انہوں نے اپنی

شخصیت کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہیں رکھا ہے اور ''زیب داستان'' سے دامن بچاتے ہوئے اپنی کتابِ زیست کو انکسار اور صداقت سے پیش کر دیا ہے۔ سادگی و پرکاری اور لطافت زبان اس خودنوشت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مقبول احمد صاحب کا اسلوبِ تحریر رواں دواں ہے۔ یہ رَوانی اور سادگی پوری کتاب میں نظر آتی ہے۔ عبارت میں جیسے ایک بہاؤ ہے جو مطالعے کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ زبان و بیان اور طرزِ تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے۔ جا بجا انہوں نے اپنی تحریر کو برمحل اُردو اور فارسی اشعار سے سجایا ہے جس سے لطف خاص پیدا ہو گیا ہے۔ برسبیل تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ مقبول صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر ارشد مقبول کو جسمانی اور ذہنی صحت کے تحفظ کی موعظت کرتے وقت غالبؔ کا مقبول عام شعر:

تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

(ص ۱۴۳)

پیش کیا ہے۔ گرچہ یہ شعر غالبؔ سے منسوب چلا آ رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شعر قربان علی سالکؔ کا ہے جو غالبؔ کے عزیز شاگرد تھے۔ شعر یوں ہے:

تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

مقبول صاحب لاہور کے ایک ممتاز اور معروف ناشر ہیں۔ ان کا اشاعتی ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' اپنی علمی و ادبی کتب کے حوالے سے پاکستان کے چند بڑے ناشرین میں شہرت رکھتا ہے۔ اس ادارے نے فکشن، تاریخِ اسلام، تفاسیر اور اردو کے اعلیٰ کلاسیکی ادب کے علاوہ متعدد مشاہیرِ اسلام پر دلکش کتابیں شائع کی ہیں۔ مسلمان

بچوں کے کومل ذہن پر اسلاف کے کارناموں کے نقوش ثبت کرنے اور اسلام کو متعارف کرانے کے پیشِ نظر بچوں کے لئے بہت ساری کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ وہ بڑے صاحبِ ذوق ہیں۔ انہوں نے اپنے ادارے سے شائع ہونے والی تمام کتابوں کو بڑے اہتمام، خوش اسلوبی اور آرائش وزینت کے ساتھ چھاپا ہے۔ ان کا شمار شعبہ طباعت کے چند بڑے ناموں میں ہوتا ہے۔ ناشر اور مصنف کے درمیان کمرشل تنازعہ ایک عام سی بات ہے لیکن مقبول احمد صاحب نے آج تک کسی مصنف کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ نہایت شریف النفس، منکسر المزاج، خداترس، سادہ دل اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ وہ باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے لیکن اپنی خداداد صلاحیت، محنت، لگن اور حسنِ سلوک سے انہوں نے اپنی مستحکم پہچان بنائی ہے اور ایک کامیاب پبلشر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ مقبول احمد صاحب صحافت سے کلیتہً واقف ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے لاہور سے ''چودھویں صدی'' نامی پندرہ روزہ میگزین کا اجرا کیا تھا جس کے نگران احسان دانش تھے۔ رسالے کو مقبولیت تو حاصل ہوئی لیکن نامساعد حالات کے سبب زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رکھ سکے۔ ایک ادبی ماہنامہ ''نئے زاویے'' کا بھی ڈیکلریشن مل گیا تھا لیکن مقبول صاحب اس سے استفادہ نہ کر سکے۔ رئیس احمد جعفری نے مولانا آزاد کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ''آزادی ہند'' کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا جسے مقبول اکیڈمی نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے تھے جس پر مشاہیر اور اعلیٰ حکام کے خطوط شاملِ کتاب ہیں۔ مقبول احمد صاحب نے عوام الناس سے لے کر مذہبی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور علمی وادبی میدانوں میں بلند و بالا شخصیات سے قربتوں والے مراسم استوار کر رکھے ہیں۔ تقریباً پچاس سال سے انہیں ادبا، شعرا، مصنفین، مترجمین، معلمین، محققین اور کتابوں کی

ہمہ وقت رفاقت میسر ہے اور انہوں نے سب کا رنگ قبول کیا ہے۔ غلام جیلانی برق، اے حمید، مرزا ادیب، مشفق خواجہ، انور سدید، ادا جعفری، حمید کاشمیری، محشر بدایونی، ڈاکٹر وحید قریشی، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر رشید امجد، ام عمارہ، غلام الثقلین نقوی اور اظہر جاوید جیسے دیگر زعمائے ادب کے گرانقدر خطوط سے کتاب مزین ہے۔ اس کے علاوہ مقبول اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب 'رن کچھ سے چونڈہ تک' پر اعلیٰ حکام کے خطوط بھی زینت کتاب ہیں۔ موقر ہفت روزہ ''فیملی'' اور روزنامہ ''دن'' (لاہور) سے مقبول احمد کا انٹرویو خاصا اہم ہے۔ سوالوں کے جواب میں انہوں نے کارآمد باتیں کی ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر حسین پیرائے میں کیا ہے۔ کتاب کے اخیر میں مقبول اکیڈمی کی مطبوعہ کتابوں پر اہلِ قلم کے تبصرے اور کالم شامل ہیں جو ملک کے معیاری رسائل میں طبع ہو چکے ہیں جن سے کتابوں کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

مقبول احمد صاحب اپنے دنیاوی فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے اور ماشاء اللہ بیٹے، بیٹی اور داماد چاروں ڈاکٹر ہیں اور سب کے سب کماؤ پوت اور فرماں بردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مقبول احمد صاحب کو مالی دولت کے ساتھ نیک نامی کی دولت سے بھی نوازا ہے۔

''سفر جاری ہے'' کے مطالعہ سے دیدہ و دل روشن ہو گئے۔ کتاب کے حسن ظاہری و معنوی اور صاحبِ کتاب کی پروقار اور جہاندیدہ شخصیت سے میں حد درجہ متاثر ہوا۔ کتاب کیا ہے انکشافات کا ایک بوطیقا ہے۔ میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا) اعمال نامہ (سر رضا علی) ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتون) سرگزشت (عبدالمجید سالک) نقش حیات (مولانا حسین احمد مدنی) عمر رفتہ (تقی محمد خان) یادوں کی برات

(جوش ملیح آبادی) اجملِ اعظم (انتظار حسین)، جہانِ دانش (احسان دانش) مٹی کا دیا (مرزا ادیب) الکھ نگری (ممتاز مفتی) غبارِ خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد) کارِ جہاں دراز ہے (قرۃ العین حیدر)، خواب باقی ہیں (آل احمد سرور) اپنی تلاش میں (کلیم الدین احمد) لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری) جہاں خوشبو تھی (کلیم عاجز) لمحوں کے چراغ (علی سردار جعفری) یادوں کا جشن (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر) اس آباد خرابے میں (اختر الایمان) یادوں کی رہگزر (علی جواد زیدی) گھومتی ندی (وارث کرمانی) رقصِ شرر (ملک زادہ منظور احمد) دیواروں کے بیچ اور دیواروں کے باہر (ندا فاضلی) سورش دوراں اور ہم ساتھ تھے (حمیدہ سالم) سحر ہونے تک (آغا جانی کشمیری) نوائے سروش (رفعت سروش) چھوٹی سی بات (زبیر رضوی) میری کہانی (اویس احمد دوراں) دیکھا ہندوستان (حسن رضوی) اور یادوں کا سفر (عقیل احمد خاں) اردو کی شاہکار آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے۔ ''سفر جاری ہے'' کو ایک اہم اور دقیع اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا سرورق معنی خیز ہے۔ کاغذ، کمپوزنگ اور طباعت جاذبِ نظر ہیں۔ یہ کتاب ایک سوغات کی طرح ہے جس کا خیر مقدم یقینی طور پر کیا جائے گا۔

ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ

مئی، جون 2008ء



حکیم محمد عزیز الرحمٰن جگرانوی

چیئرمین حمایت اسلام طبیہ کالج (لاہور)

خدا پر یقین پختہ کرنے والی خودنوشت

ملک مقبول احمد کی خودنوشت "سفر جاری ہے" کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ۔ سادگی، پرکاری اور عجز وانکساری کی سیاہی سے لکھی گئی یہ خودنوشت پڑھنی شروع کی تو کتاب اس وقت تک ہاتھ سے نہ چھوٹی جب تک اس کا مطالعہ مکمل نہ ہوا۔ ملک مقبول احمد جو کہ پہلے ہی میرے محترم اور شفیق بزرگ ہیں کا مقام ان کی یہ خودنوشت پڑھ کر میرے دل میں اور بھی اعلیٰ وارفع ہو گیا۔ کیونکہ یہ صرف انؐ کے حالات زندگی سے واقفیت کا ذریعہ ہی نہیں ان کے جذبات واحساسات سے مکمل آگاہی کا وسیلہ بھی ہے اپنے بچپن کی یادداشتوں ،لڑکپن کی شرارتوں اور جوانی شوخیوں کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کی مشکلات اور آزمائشوں کا تذکرہ انہوں نے اپنے عقائد سے مہمیز کر کے اس قدر مہارت سے کیا ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ:

کسی بھی ستون کے بغیر آسمان کی یہ بے پایاں وسعت نہ جانے کب سے ہمارے سروں پر تنی کھڑی ہے۔ ہمارے نظام شمسی، پھر دن میں باشندگان زمین کو میسر سورج کی بے پناہ روشنی اور اندھیری شب میں جگمگاتے ستاروں سے آراستہ ہمارے سر پر تنا آسمان، الغرض ہماری نظروں میں سمانے والی ہر شے پر کسی بھی پہلو سے غور کیا جائے تو

یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ہر شے کامل واکمل طور پر براہ راست یا بلاواسطہ اولاد آدم کو آرام وفیض پہنچانے میں معروف ہے۔ ظاہر ہے کہ رب کائنات نے ان سب کی تخلیق فرمائی اور حکم دیا کہ وہ اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے جائیں۔ ظاہر ہے کائنات کی ہر شے اولاد آدم کی خدمت میں معروف ہے تو کچھ ہم سے بھی چاہا جا رہا ہوگا۔ یا کچھ فرائض ہمیں بھی تفویض کر دیے ہوں گے۔ اس دنیا میں ہر انسان اپنے رب کی تخلیق کردہ دیگر مخلوقات کا اور نعمتوں کا بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ جیسے ہوا، پانی، خوراک اور نہ جانے کس قدر اور بھی چیزیں ہیں جو اس کے استعمال میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے ان چیزوں کی کہیں تو Counting ہو رہی ہوگی اور یہ Counting بھی ایسی ہے جس میں کسی ہیرا پھری کی گنجائش ممکن نہیں۔

اب یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ کس طرح ہم محشر کے روز اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں سے خود کو بچا سکیں گے؟ وہ کیا امور ہیں جن کا ہمیں دھیان رکھنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک طرف زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ہر طرح کے مواقع کے ساتھ نعمتیں بھی عطا کی ہیں۔ انسان اتنا کوتاہ بین ہے کہ اسے صرف مال ودولت کے علاوہ اپنے پاس کی دیگر نعمتیں دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ کون انسان ہے جس نے اپنے اعضاء اور ہاتھ پاؤں اور ان کی انگلیوں کے لیے کبھی اللہ کا شکر ادا کیا ہوگا۔ ایک پیر دوسرے سے ایک ملی میٹر ہی چھوٹا ہو تو انسان کی چال میں لنگراہٹ آجاتی ہے کیا کسی نے اپنے دونوں پیروں کی یکساں لمبائی کے مقابل اظہار تشکر بہ بارگاہ رب العزت کیا ہے۔ ایک آنکھ اور دوسری آنکھ میں ہی ایک ملی میٹر کے دسویں حصے ہی کا فرق ہو جائے تو انسان بدصورت دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے جس نے اس گراں قدر عنایت پر بارگاہ الٰہی میں جذبات سپاس کا نذرانہ پیش کیا ہوگا۔

اسی لیے ہمارا رب فرماتا ہے کہ ''و قلیل من عبادی الشکور'' ''میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی پائے جاتے ہیں''۔ ان نعمتوں کے علاوہ بھی بے شمار نعمتوں کا ہم بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ''ان تعدوا نعمت اللہ لا تحصو ھا'' ''اے انسانو! تم اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن بھی نہ سکو گے'' مگر بہت کم انسانوں کو احساس ہے کہ ان تمام نعمتوں کے ذریعے ہی اس کا امتحان بھی لیا جا رہا ہے۔ یہ بہر حال طے ہے کہ ہم اپنے ہر عمل، ردِ عمل، معاملہ، ہر روّیہ اور ہر سلوک، اپنی زبان یا قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی جواب دہی کے لیے ایک مقررہ دن اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس دن نہ صرف قول، فعل اور عمل بلکہ ہمارے دلوں میں اٹھنے والے جذبات اور خیالات کے تعلق سے بھی ہم سے سوال ہو سکتا ہے ''و ان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ'' تم اگر کوئی بات اپنے جی میں چھپا لو یا اسے ظاہر کرو (ہر صورت) اللہ اس کا حساب تم سے لے گا۔

ہم میں سے کتنے ہیں جو خود کو رضا کارانہ طور پر احتساب کے لیے پیش کرتے ہیں اپنے دل میں چھپی ہوئی باتیں اپنی نیتوں کے فتور اپنے پوشیدہ اعمال اور اپنے ظاہری ڈھونگ کھول کر بتا دیتے ہیں۔ کتنے ایسے عمر رسیدہ لوگ ہیں جو اپنی بچپن کی کوتاہیوں، لڑکپن کی لغزشوں اور جوانی کی سیاہ کاریوں کو بالکل آئینے کی طرح واضح کر کے دکھا دیتے ہیں۔ یقیناً ایسے پیران با صفا بہت کم ہوں گے ایسے انتہائی کم صاف گو بزرگوں میں سے ایک بزرگ کو میں جانتا ہوں۔ ان کو لوگ ملک مقبول احمد کے نام سے جانتے ہیں۔

وہ مقبول اکیڈمی لاہور کے چیئرمین ہیں۔ عزیزی علامہ عبدالستار عاصم نے ان کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' مجھے مطالعہ کے لیے دی تو پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ کسی شاعر نے ان کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

مسکراہٹ دل نشیں اور شخصیت معقول ہے
نام بھی مقبول ، اس کا کام بھی مقبول ہے

باوجود اس کے کہ عملی زندگی کے شروع سے لیکر آج تک اکثر اوقات ملک مقبول احمد موصوف کو بار بار دھوکے دیئے گئے مختلف رشتہ داروں اور دوستوں کے بھیس میں دشمنوں نے انہیں قدم قدم پر نقصان پہنچائے مگر انہوں نے کبھی بھی نہ تو کسی کا شکوہ کیا ہے اور نہ ہی اپنے درویشانہ رویے میں کبھی کوئی امتیاز پیدا کیا ہے۔ ہر ایک سے ایک ہی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔انہوں نے انتہائی سخت ترین مالی حالات بھی دیکھے اور اب خدا کے فضل سے ایک ترقی یافتہ بزنس مین ہیں مگر ان دونوں حالتوں میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرنا کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ اپنی خودنوشت سفر جاری ہے میں لکھتے ہیں کہ مجھے بچپن سے ہی قدرتی مناظر میں کھو جانے کی عادت تھی۔ان قدرتی مناظر سے میں اللہ خالق کائنات کی کاریگری وصناعی کا قائل ہو جاتا تھا اور یہ تصور کر کے میرے جسم کے تمام اعضاء احساس تشکر سے بارگاہ خداوندی میں عجز و نیاز سے جھک جاتے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جن کا ہمیں اپنی نادانی میں احساس ہی نہیں ہوتا مگر وہ ہماری زندگی میں بڑی اہم ہیں۔ ان نعمتوں کے لئے خالق کائنات کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اپنی شہرہ آفاق خودنوشت ''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے جابجا اللہ تعالیٰ خالق کائنات کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کیا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

''مقبول اکیڈمی'' قائم کرنے کے بعد ہی میں نے زندگی کی ایک بڑی شاہراہ پر قدم رکھ دیا تھا۔اس شاہراہ پر چلتے چلتے بڑے کٹھن مقامات آئے۔ مجھے کئی حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، خوداعتمادی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہر مشکل کا

یقین اور حوصلے سے مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ مقبول اکیڈمی کا قیام کسی جلد بازی کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے میرا عزم اور اس کاروبار کا گہرا مشاہدہ تھا۔ میں نے ملک میں موجود اشاعتی اداروں کا بغور جائزہ لیا تھا، ان کے طریق کار کو سمجھا، اور بڑے غور و فکر کے بعد ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے کتابوں کی دنیا میں ایک معتبر اور قابلِ رشک ادارہ بنانے کے لیے ہمت کی کمر باندھ لی۔ لاہور میں اس وقت کئی نامور اشاعتی ادارے کام کر رہے تھے۔ میں ان سے خوف زدہ نہیں تھا اور نہ ہی میرا ارادہ ان سے ''مقابلہ آرائی'' کا تھا۔ ان اداروں کی کامیابی میرے لئے مثال تھی اور میں ایسی کتابوں کی اشاعت کا خواہش مند تھا جن سے آئندہ نسلیں بھی مستفید ہوں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ مقصد اگر محض تجارت اور نفع کمانا ہوتا تو اس کے بھی سو طریقے اشاعتی دنیا میں موجود تھے۔ میں نے ان سب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ کتاب چھاپنا ہوتا تو فوراً شائع کی جاسکتی تھی لیکن میں ایسی کتابوں کی تلاش میں تھا جو دنیا کو روشنی فراہم کرتیں اور نہ صرف میرے لیے افتخار کا باعث ہوتیں بلکہ میری شفاعت کا وسیلہ بھی بنتیں۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد میں نے اس دور کے بے مثال ادیب جناب رئیس احمد جعفری سے ملاقات کرنے اور رہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُن دنوں ٹیگور پارک (میکلوڈ روڈ) میں قیام پذیر تھے۔ رئیس احمد جعفری بڑے باکمال ادیب تھے۔ ملک اور قوم کا درد ان کے دل میں سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے قلم کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے استعمال کرتے تھے اور تصنیف و تالیف ان کی زندگی کا ایک اعلیٰ نصب العین تھا۔ وہ اُن دنوں شہرت کے عروج پر تھے۔ مجھے اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور کچھ دیر کی بات چیت کے بعد

میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ جعفری صاحب بہت وضع دار اور شریف النفس انسان تھے۔ میری استدعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ بہت جلد مجھے اپنے چند مسودوں سے نوازیں گے۔

اشاعت کے پیشے میں یہ میرا اولیں قدم تھا۔ رئیس احمد جعفری صاحب کی نوازش نے مجھے ایک نیا عزم اور حوصلہ بخشا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس روز میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان دنوں جعفری صاحب کی کوئی کتاب چھاپنا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ وہ اس دور میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مقبول ترین مصنف تھے اور ادب کے تمام گوشوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے وعدے کے مطابق انہوں نے مجھے دو ناولوں کے مسودے عنایت فرمائے اور میں نے یہ دونوں ناول بہت تھوڑے وقت اور خوبصورت انداز میں شائع کر دیئے۔ اور قیمت زیادہ نہ رکھی تاکہ جلدی بک جائیں۔

ان ناولوں کے بازار میں آتے ہی ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ دونوں ناول بہت پسند کیے گئے اور تھوڑے سے وقت میں فروخت بھی ہو گئے۔ میرا سرمایہ مناسب منافع کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں جعفری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھے مبارکباد دینے کے لئے خود اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے سینے سے لگا کر پہلی کامیابی پر شاباش دی۔

''مقبول اکیڈمی'' نے مقبولیت کی شاہراہ پر یہ پہلا قدم رکھا تھا۔ میں اپنے معبود کے آگے سربسجود ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں جعفری صاحب کے ناولوں کی بہت مانگ تھی۔ وہ زبان و بیان کے ماہر تھے اور عوام کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ انوکھے اور مقدس ہوتے تھے لیکن ان میں ہلکی سی رومانی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ کالجوں کے طلباء اور طالبات نوجوان اور بوڑھے سب ان کے ناولوں کے شیدائی تھے۔ ان ناولوں کی غیر معمولی مقبولیت اور فوری فروخت نے مجھے ایک نیا حوصلہ اور خود اعتمادی دی۔

اس کے بعد 1959ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت ''انڈیا ونز فریڈم''(India Wins Freedom)شائع ہوئی تو جعفری صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کتاب کا اُردو ترجمہ شائع کیا جائے۔ اُن کا یہ مشورہ بلاشبہ صائب اور بروقت تھا۔ میں نے استدعا کی کہ وہ اپنے جواہر نگار قلم سے خود اس کا ترجمہ کریں۔ انہوں نے میری گزارش قبول کر لی اور ترجمہ شروع کر دیا۔ میں نے ساتھ کے ساتھ اس کی کتابت شروع کروادی۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم نے اس کتاب کو ''آزادی ہند'' کے نام سے صرف ایک ماہ میں شائع کر دیا۔ یعنی ایک ماہ میں اس کا ترجمہ بھی ہوا، کتابت بھی ہوئی اور کتاب چھپ کر تیار بھی ہو گئی۔ کتاب کا ٹائٹل مشہور و معروف آرٹسٹ جاؔلی صاحب نے بنایا اور اس کے ظاہری حسن نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کتاب نے بھی اشاعتی مارکیٹ میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن چند ہی دنوں میں ختم ہو گیا۔ پھر دوسرا ایڈیشن اور تیسرا ایڈیشن چھپا۔ یعنی ایک ماہ میں اس کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اشاعتی دنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جس کے آرڈرز ہمیں پورے ملک سے ٹیلی گرام کے ذریعے موصول ہوتے رہے''۔

''آزادی ہند'' بظاہر انگریزی سے ترجمہ کی گئی کتاب تھی لیکن اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں جعفری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ان باتوں کا مدلل جواب بھی دے دیا تھا جو انہوں نے پاکستان کے خلاف لکھی تھیں۔ اخبارات میں کتاب کے بارے میں جو تبصرے شائع ہوئے، اُن میں ملے جلے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ چند اخبارات نے سیاسی اختلافات کی وجہ سے کتاب پر مخالفانہ تبصرے کیے اور بعض نے اس کے حق میں۔ ان تبصروں کی وجہ سے بھی کتاب کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ ''آزادی ہند'' نے مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اور عالم یہ ہے کہ آج تک اس

کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب تک ہو رہے ہیں۔ آزادی ہند پاکستان میں شائع ہونے والی واحد کتاب تھی جس کی تعریف میں ملک کی بڑی بڑی نامور شخصیات نے ہمیں تعریفی خطوط بھیجے۔ ان شخصیات میں جناب قدرت اللہ شہاب، جناب ہاشم رضا، مولانا حامد علی خان، چودھری محمد علی، جناب مشتاق احمد گورمانی، ممتاز دولتانہ، گورنر مغربی پاکستان اور خان عبدالقیوم خاں جیسی شخصیات شامل تھیں۔ (یہ خطوط اس کتاب میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا کوثر نیازی خود میرے پاس بلڈنگ کی تیسری منزل پر سیڑھیاں چڑھ کر تشریف لائے اور اپنے پرچے میں تبصرے کے لئے دو کتابیں لے گئے۔ ''آزادی ہند'' کی کامیابی نے مقبول کو بھی بے پناہ مقبولیت بخشی''۔

''آزادی ہند'' کی اس کامیابی نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔ ماضی کی ناکامیوں نے مایوسی کے جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میرے ذہن وقلب پر مسلط کر دیئے تھے وہ سب دور ہو گئے اور مجھے روشنی میں لا کھڑا کیا۔ یہ میری عملی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے درخشاں کامیابی تھی۔ کراچی سے شیخ شوکت علی اینڈ سنز کے شیخ شوکت علی اور نفیس اکیڈمی کے اقبال سلیم گاہندری صاحب شاہ عالمی میرے دفتر میں آئے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کے الفاظ سے نوازا اور اس نوآموز کو مبارکباد دی۔ شیخ شوکت علی اور سلیم گاہندری صاحب کی اشیر باد نے مجھے نیا ولولہ عطا کیا۔ اس کے بعد رئیس احمد جعفری کی بہت سی کتابیں مقبول اکیڈمی سے میں نے شائع کیں، ان میں ''قائداعظم اور انکا عہد'' ''خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد'' ''خطبات قائداعظم'' ''خون کی ہولی'' ''شہاب الدین غوری'' ''تغلق'' ''یزید'' اور ''یورش'' کے علاوہ کئی ناول بھی شامل ہیں۔ میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ:

روشنی اگر خدا کو ہو منظور
آندھیوں میں چراغ جلتے ہیں

انہیں ایام میں جناب احسان دانش صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اُن کے پاس ایک نہایت نایاب کتاب ہے۔ میں اگر اسے شائع کرنا چاہوں تو ان سے لے کر شائع کر سکتا ہوں۔ اس کتاب کا نام تھا۔ "تمدن عرب" اور اس کے مصنف فرانس کے نامور صاحب قلم "گستاؤلی بان" تھے۔ "تمدن عرب" بڑی ضخیم اور باتصویر کتاب تھی۔ اور حوالے کے طور پر کثرت سے استعمال ہوتی تھی میں نے احسان دانش صاحب سے یہ کتاب پانچ سو روپے میں خرید لی۔ اُن دنوں پانچ سو روپے ایک خطیر رقم ہوا کرتی تھی۔ یہ کتاب قیام پاکستان سے پہلے نواب حیدر آباد دکن کی سرپرستی میں شائع ہو چکی تھی اور اس کا اُردو ترجمہ ایک عظیم شخصیت سید علی بلگرامی صاحب نے کیا تھا۔ کتاب تو میں نے بڑے شوق سے خرید لی مگر جب اشاعت کا مرحلہ آیا تو اس کے اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ نکلا۔ میرے پاس رقم ناکافی تھی۔ خوب سوچ بچار کے بعد میں اپنے بڑے ماموں کے پاس گیا جو میرے سسر بھی تھے۔ نہایت ادب وانکسار سے اپنا مدعا بیان کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔ کیوں کہ روپے پیسے کے اعتبار سے اُن کی پوزیشن بہت مضبوط تھی لیکن افسوس کہ انہوں نے میری مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے ماموں محمد حسین صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے نہایت شفقت اور مہربانی سے مجھے کچھ رقم عنایت فرما دی جس سے کام کا آغاز ہو گیا لیکن اخراجات بہت زیادہ ہونے کے باعث تیزی سے پیش رفت نہ ہو سکی۔ کتاب باتصویر تھی اور اسی وجہ سے اخراجات زیادہ تھے"۔

"مایوسی کے اس اندھیرے میں مجھے اپنے ایک قلمی دوست ملک اللہ داد صاحب کا خیال آیا جو ضلع میانوالی کے ایک گاؤں سلطان خیل میں رہتے تھے۔ اُن سے بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ صرف قلمی دوستی ہی شناسائی کا ذریعہ تھی۔ خداوند کریم کا نام لیتے ہوئے میں اُن کے پاس سلطان خیل (میانوالی) جا پہنچا۔ مجھے اس طرح اچانک اپنے

سامنے پا کر انہیں حیرت بھی ہوئی اور انتہائی مسرت بھی۔وہ ملاقات آج بھی میرے ذہن کے پردے پر ایک متحرک تصویر کی طرح جاگزیں ہے۔ملک صاحب نے جی کھول کر میری آؤ بھگت کی اور پھر نہایت ملائمت بھرے لہجے میں میری آمد کا سبب دریافت فرمایا۔میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ اپنی پریشانیوں کا اظہار کر دیا۔جواب میں انہوں نے کمال مروت اور محبت کے ساتھ مجھے پانچ ہزار روپے عنایت فرما دیئے۔اُن دنوں پانچ ہزار روپے لاکھوں کے برابر تھے۔انہوں نے بڑی انکساری کے ساتھ رقم میری ہتھیلی پر رکھی اور میرے چہرے کی طرف نظر تک نہیں اُٹھائی۔رقم کی واپسی کے متعلق اشارہ تک نہیں کیا۔میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنوں کے مقابلے میں غیر اس قدر مہربان اور شفیق بھی ہو سکتے ہیں۔انہوں نے مجھے یہ رقم دے کر مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیا تھا"۔

"(یہاں مجھے ایک بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ جب کوئی شخص ہم پر احسان کرتا یا مشکل وقت میں ہماری مدد کرتا ہے تو ہم اُس کے احسان کا ذکر کرتے نہیں تھکتے لیکن رب العالمین جو ہر لحہ ہم پر اپنی رحمت کی بارش کرتا رہتا ہے ہم اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم میں رب العالمین نے فرمایا ہے کہ "انسان احسان فراموش اور کھلا جھگڑالو ہے" میرے نزدیک ہمارے تمام مصائب کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم اللہ کے احسانات اور نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے)"۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا اپنے قلمی دوست ملک اللہ داد خاں صاحب کا کہ جنہوں نے میری اس وقت مدد فرمائی جب اپنوں نے بھی منہ موڑ لیا تھا۔شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

میں اپنے دوست ملک اللہ داد خاں صاحب کا آج بھی ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے انتہائی مشکل گھڑی میں اس ناچیز کی مدد فرمائی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے عمر بھر رقم کی واپسی کا مطالبہ تو دور کی بات ہے کبھی اس رقم کا ذکر تک نہ کیا۔ میں نے خود ہی قسطوں میں وہ رقم ادا کی۔ بلکہ ایک قسط تو اُن کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کو بھجوائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین!"

بات وہی ہے کہ انسان اگر دُکھ سکھ میں، سفر حضر میں، سوتے جاگتے میں، کھانے پینے میں حتیٰ کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات کا شمار کرنے لگے تو نہیں کر سکتا البتہ ایک کام کر سکتا ہے کہ اس بارگاہِ ایزدی میں سجدہ شکر بجالائے۔





ڈاکٹر علامہ سید ایاز ظہیر ہاشمی
چیئر مین قومی امن کمیٹی برائے بین المذاہب ہم آہنگی پاکستان

کچی مٹی تو مہکے گی

ایک نوبل انعام یافتہ کتاب "میموریز" ("یادیں") کو نوبل انعام شاید اس لیے دیا گیا کہ اس کے مصنف نے اپنی اس خودنوشت میں اپنی کسی بھی ذاتی کمزوری کو چھپانے یا پوشیدہ رکھنے کی معمولی سی بھی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس مصنف پابلونرودا نے اپنی والدہ کے ان عشقیہ خطوط کا بھی ذکر کر دیا ہے جو کہ اس نے پابلونرودا کے والد سے شادی سے پہلے کے اپنے ایک محبوب کو لکھے تھے اور انہیں حسین یادگار کے طور پر اپنے گھر میں موجود اپنے اٹیچی کیس میں رکھا ہوا تھا۔ پابلونرودا نے لکھا ہے کہ یہ خط پڑھ کر میرے دل میں میری والدہ کی عزت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اسی طرح کے دیگر اعترافات وانکشافات کی بناء پر پابلونرودا کی یہ خودنوشت دنیا کی نوبل خودنوشت بن گئی۔

اسی طرح برصغیر پاک وہند کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی کی خودنوشت "یادوں کی برات" بھی اس حوالہ سے منفرد ترین خودنوشت ہے جس میں جوش ملیح آبادی نے اپنی زندگی میں ہونے والے اپنے تمام معاشقوں کا ذکر بڑی اعلیٰ ظرفی اور کمال سچائی سے کیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے برملا کہا ہے کہ وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں۔ اسلام کی عظیم شخصیات کو وہ ان کے کردار کی بلندی کی وجہ سے عظیم تسلیم کرتے ہیں۔ نہ کہ مذہب کی وجہ سے۔ انہوں نے سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی عظمت کردار پر متعدد نظمیں بھی لکھی ہیں، سلام بھی کہے

ہیں اور قصیدے بھی مگر اپنا عقیدہ واضح کر کے انہوں نے اپنی ذات کو کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے کہ جو چاہے اسے محبت دے جو چاہے نفرت کرے ان کا یہ شعر ان کے علمی وتاریخی شعور کا حوالہ ہے۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

مندرجہ بالا دونوں دانشوروں کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے حوالہ سے صرف اور صرف سچ کو نمایاں کیا ہے جھوٹ اور مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا جبکہ ان دونوں شخصیات کے عقائد سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ اسی طرح اور بھی کئی ایسے دانشور، ادیب، شاعر اور نثر نگار ہیں جنہوں نے صرف سچ کو ہی اپنا وکیل بنایا ہے چاہے اس سچ کے بدلے میں انہیں اپنے اپنے زمانوں اور معاشروں میں لوگوں کی تنقید اور بعض حلقوں کی طرف سے دشنام وآلام کا ہی توشہ وصول کرنا پڑا۔ بہر حال باہمت اور حق گو فنکاروں کے یہ جرأت نامے جب بھی منصہ شہود پر آتے ہیں تو قارئین خوب محظوظ ہوتے ہیں۔

اسی طرح 2007ء میں پاکستان کے معروف پبلشنگ ادارے مقبول اکیڈمی اردو بازار لاہور کے چیئرمین تجربہ کار پبلشر اور نامور ادیب ملک مقبول احمد نے اپنی خود نوشت ''سفر جاری ہے'' لکھی تو ادبی وعلمی حلقوں میں ایک قسم کا تہلکہ مچ گیا کیونکہ اس خود نوشت میں مصنف نے اسی روایت کو پھر سے تازہ کر دیا تھا کہ جس روایت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو لکھوں گا سچ لکھوں گا چاہے اس سچ کا خمیازہ ہی بھگتنا پڑے۔ دو سال تک تو اس شہرۂ آفاق خود نوشت کی دید کی حسرت ہی رہی بالآخر یہ حسرت میرے ہمدم علامہ عبدالستار عاصم نے اس طرح پوری کی کہ یہ کتاب خود ملک صاحب کے دستخط سے میرے نام پر لے آئے۔ اسے پڑھا تو دلی سکون بھی ہوا اور اپنے ملک کے عصر حاضر کے ادیب پر فخر بھی۔

بہر حال ملک مقبول احمد اوّل الذکر دونوں ادباء و مصنفین کے برعکس راسخ العقیدہ مسلمان، قدم قدم پر خالق کائنات کے شکر گزار، اور مدنی آقا ﷺ کے جانثار ہیں۔ اپنی ماں کے قدموں میں جنت تلاش کرنے والے اور اپنی ترقی و مقبولیت کو ماں کی دعاؤں کا ثمر تصور کرنے والے ہیں۔ انتہائی شریف اور سادہ لوح دیہاتی ہیں ان کا انداز تحریر گو کہ ادیبانہ ہے مگر اس میں دیہات کی سوندھی مٹی کی مہک محسوس ہوتی ہے۔ اس خودنوشت میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ پنجاب کے ایک پسماندہ گاؤں کے معمولی کسان خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اپنی سادگی کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے عنفوان شباب کے دنوں میں ان خاموش محبتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہیں اپنے گاؤں کی لڑکیوں سے ہوئیں۔ یہ خاموش محبتیں تقریباً ہر نوجوان کو ہوتی ہیں مگر جب یہ نوجوان عمر رسیدہ ہو کر پوتوں اور نواسوں والے ہو جاتے ہیں تو ان فطری محبتوں کا اقرار و اظہار کرنے سے احتراز کرتے ہیں مگر ملک مقبول احمد نے کمال روشن خیالی سے اس کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی غربت کے دنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اپنی محنت و مشقت کا ذکر بھی کیا ہے۔ زمانے کی کلفتوں اور اپنوں، بیگانوں کے جھڑکوں کا بھی ذکر انتہائی سادگی اور سچائی سے کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے محسنوں کو بھی خوب صورت پیرائے میں ڈسکس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' میں ''گاؤں کا ساون'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''ساون میں بادل امنڈ کر آتے اور بارش کھل کر برستی۔ ندی نالے، کھیت کنویں اور جوہڑ سب بھر جاتے۔ سطح زمین پانی کی ہموار چادر نظر آتی۔ زرد رنگ کے مینڈک ہزاروں کی تعداد میں نہ جانے کہاں سے آجاتے اور کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ایک ساتھ ٹراتے۔ چوہے، سانپ، نیولے خشک جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر نکل جاتے کچھ درختوں پر بھی چڑھ جاتے جہاں سے انہیں چیلیں، اور شکرے پکڑ کر کھانے کے لیے اونچے درختوں پر

لے جاتے۔ جو انسانوں کے ہتھے چڑھ جاتے وہ مارے جاتے۔ کن کھجورے اور بچھو وغیرہ بھی اپنی جانیں بچانے کیلئے زمین کے نیچے پانی بھر جانے سے گھروں کے کچے فرشوں پر نکل آتے۔ اور کوؤں، مرغیوں اور چوزوں کا مرغوب کھاجا بن جاتے۔ سانپ اور بچھو کے کاٹنے کی وارداتیں بھی ہوتیں۔ جس کسی کو سانپ کاٹتا تو اس کے عزیز و اقارب اسے لے کر خانہ بدوشوں کی طرف دوڑتے کہ منکہ لگوائیں۔ منکہ زہر کو جسم سے چوس لیتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈراپر کی ربڑ کی ٹوپی دوائی کو شیشے کی نالی کے اندر کھینچ لیتی ہے۔ بچھو کا کاٹا بچہ تو درد سے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ خود میرے پاؤں پر دو دفعہ بچھو نے کاٹا ہے۔

بچھو اگر نظر آ جاتا تو اسے مار کر کاٹے جانے کے نشان پر مٹی کا تیل لگانے کے بعد باندھا جاتا۔ اسے یہ درد کا توڑ سمجھا جاتا تھا۔ غرضیکہ اس قسم کی تکلیفیں بارش کا حصہ تھیں۔ جب کہ بڑے مصائب میں، کچے مکانوں کا گر جانا، گڑھوں یا نالوں میں کسی کا گر جانا اور مویشیوں کے لیے چارے کی کمی اور بھری ہوئی فصلوں کا ڈوب جانا شامل تھے۔ ان دنوں گھر میں بیت الخلاء نہیں ہوتے تھے۔ رفع حاجت کے لیے کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ برسات کے موسم جہاں خشک جگہ ملتی رفع حاجت کے لیے استعمال کر لی جاتی لیکن اس سے بدبو بھی پھیل جاتی تھی۔ دوسری طرف جوہڑوں کے بھر جانے کی وجہ سے برسات کی پہلی بارش پیغامبرِ حیات بھی تھی۔

اسی طرح میلے ٹھیلے اور ناٹک کے عنوان سے دیہات کے کلچر کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔ بندر اور ریچھ کا تماشہ دکھانے والے، کلائی پر آہنی کڑے چڑھا کر ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ڈنڈے مار کر گانا گانے والے، پھوڑے پھنسیوں پر جونکیں لگانے والے، طوطے سے فال نکلوانے والے، آیتوں کے دم سے مختلف روگوں کا علاج کرنے والے، دور دراز خانہ بدوشوں کے ڈیروں سے آتے اور اپنے اپنے فن کے تماشے دکھا کر پیسہ دو پیسے،

آٹا، چاول وغیرہ اکٹھے کر کے چلے جاتے۔ کئی فقیر تماشے تو نہ دکھاتے لیکن ہر دروازے پر "دعا فقیراں، رحمت مولا" کی صدا لگا کر خیرات پاتے۔ چند مشہور گویے بھی تھے جن کے ناموں سے ان کے گراموفون ریکارڈ بھی بنے ہوئے ہوتے۔ یہ جس گاؤں میں آتے وہاں کے لوگ اردگرد کے دیہاتوں میں ان کی آمد کی مشتہری کرتے۔ پھر ساری ساری رات گانے کی محفل جمتی۔ وہ اپنی مرضی سے اور سامعین کی فرمائش پر بھی لوک گیت سناتے۔ لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر ان کو "ویلین" دیتے۔

اسی طرح ناٹک کرنے والے گروپ بھی آتے۔ خواتین کا کردار ادا کرنے کیلئے ان میں نوجوان خوبصورت لڑکے ہوتے۔ وہ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور سسی پنوں جیسے مشہور عاشقوں کے سوانگ بھرتے۔ مکالمے بولتے اور گاتے۔ ہیروئن کا کردار ادا کرنے والا لڑکا نسوانی آواز میں گاتا اور اس پر خوب روپے نچھاور ہوتے۔ اس دور کا ایک روپیہ آج کے دور کے پچاس روپوں سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔

یہ ناٹک دکھانے والے راس دھاریے کہلاتے تھے۔ ان کا ایک ایک کھیل تین تین راتیں چلتا رہتا۔ ان تماشائیوں میں معززین بھی شامل ہوتے اور وہ کرسیوں پر اگلی صفوں میں بیٹھتے۔ کوئی ٹکٹ نہ ہوتا۔ انعام میں دی جانے والی دونّی، چونّی یا اٹھنّی پیتل کے تھال میں ڈالی جاتی جس میں سرسوں کے تیل کا دیا یا موم بتی جلا کر رکھی جاتی تھی۔ ایک روپیہ کا انعام بہت بڑا ہوتا تھا۔ خوبصورت راس دھاریہ چاندی کے روپے کے سکے تماشائی کے ہاتھ سے پکڑتا، چومتا اور سارے مجمعے میں اعلان کرتا کہ یہ انعام کس شخص نے دیا ہے۔ راس دھاریوں کو خالی ہاتھ بھیجنا توہین خیال کیا جاتا تھا اور یہ رواج کے خلاف بھی تھا۔ کہیں کبھی شعبدہ بازدن کے وقت گاؤں کی چوپالوں اور کھلی جگہوں پر وارد ہوتے وہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایسی ڈگڈگی بجاتے کہ بچے کونوں کھدروں سے نکل کر چوپالوں کی طرف

دوڑتے۔ میں خود ایسے کھیل تماشوں کا شیدائی تھا۔ میں تو ڈگڈگی کی آواز پر سکول سے بھی بھاگ نکلتا تھا۔ میرے ساتھ میرا ہندو دوست گیان چند بھی ہوتا تھا۔

کبھی کبھی جسمانی کرتبوں کے ماہر بازی گر اور نٹ بھی دیہات میں آ کر اپنا کیمپ لگاتے۔ ان کا ایک ساتھی ڈھول بجاتا اور باقی قلابازیاں کھاتے، تنے ہوئے رسے پر چڑھ جاتے۔ وہ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک بانس اٹھا لیتے۔ رسے پر چلتے چلتے ایک طرف دوسری طرف نکل جاتے اور داد پاتے۔ بانسوں پر کرتب دکھانا ان کا معمول تھا۔ جو کچھ ہم آج کل سرکسوں میں دیکھتے ہیں، وہی کرتب نٹ کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ماہرانہ نوعیت کے تماشے اور جسمانی کرتب پیش کرتے۔

تماشے کے دوران میں تماشائیوں کو راغب کرنے اور جمے ہوئے مجمعے کو قائم رکھنے کے لیے کئی قسم کی افواہیں پھیلائی جاتیں۔ کبھی کبھی کھیل تماشوں کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی افواہ ایسی چھوڑ دی جاتی جس سے ڈر کر بچے گھروں ہی میں رُک جاتے۔ ایسی افواہیں بعض اوقات خود والدین گھڑ کر پھیلاتے تھے۔ اس دور میں افواہوں کی اہمیت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے"۔

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح ملک مقبول احمد خود اپنی بنیاد اپنی مٹی اور اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور نصف صدی سے لاہور جیسے شہر میں رہنے کے باوجود آج بھی اپنے دیہات کی قدروں کے امین ہیں۔ اسی طرح ان کی خودنوشت بھی کچی مٹی کی طرح ایک من موہنی مہک کی حامل ہے۔ یہ مہک دراصل اس بے ساختہ سچ کی مہک ہے جو سچ "سفر جاری ہے" کی بنیاد ہے۔

☆☆☆



حافظ حسین احمد

(جمیعت علمائے اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملک مقبول احمد صاحب نے اپنی زندگی کے ''جاری سفر'' (جو کہ عربی کا سفر ہے) کے غیر ''مقبول'' لمحات خصوصاً جو انگریزی ''سفر'' کے حوالے سے بھی ہیں۔ دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے۔

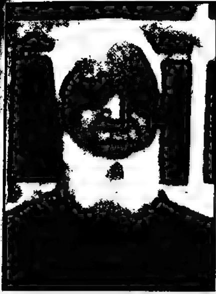
برادر عزیز علامہ عبدالستار عاصم (تین عین، ٹرپل ''A'') نے اس ''جاری سفر'' میں مطالعاتی ہمرکابی کا موقع فراہم کیا۔ چند اوراق کے بعد ملک مقبول صاحب کی مقبولیت کا ''راز'' مجھ پہ کھلا۔

انہوں نے اس ''جاری سفر'' میں اپنی ''رفیقہ سفر'' اور اس سفر میں بچوں نواسیوں اور پوتے پوتیوں کی صورت میں ''مقبول خاندان'' کو بھی ''ہم سفر'' رکھا۔ یہ اُن کے ''جاری سفر'' کے بعد ''زادِ سفر'' ہوگا۔

مخلص

حافظ حسین احمد

10 دسمبر 2009ء



میاں محمد سعید شاد

A-403، رحمان پور کالونی، لاہور

سفر جاری ہے

کھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز
لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں

(بالِ جبریل)

یہ نام ہے ایک ایسی نادر اور مبنی بر حقیقت کتاب کا جس کے مالک، ناشر، طابع اور سوانح نگار خود برادر جاں برابر محترمی جناب ملک مقبول احمد اعوان صاحب (قطب شاہی) ہیں۔ حال اس کتاب کی مقبولیت کا یہ ہے کہ اس کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔ اب چوتھا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں سوانح نگار نے اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی اور اب بڑھاپے میں جن دنیوی نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑا انہیں من و عن اور بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اُنھیں اس امر کا بلا شک و شبہ پورا یقین اور اعتراف ہے کہ موجودہ تمام ارتقائی منازل ان کے والدین کریمین کی درد بھری دعاؤں کے نتیجہ میں ملی ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنی زندگی کی ہر مصیبت سے نجات اور ہر کامیابی کے حصول کو والدین سے منسوب کیا ہے۔ ماں جی کا ادب و احترام کیوں نہ کریں کہ جب کبھی ایک پیسہ مانگا تھا تو:

ماں نے تو اپنے سارے آنسو بخش دیے
بچے نے تو ایک ہی پیسا مانگا تھا

انسانی سرشت میں کئی رذیل خصائص ہیں۔ مثلاً غصہ، بغض، حسد، تکبر و غرور، دھوکا اور فریب وغیرہ۔ ایسے اشخاص کے چہرے پر نحوست اور بے رونقی صاف عیاں ہوگی۔ جن کی سرشت نیک اور صالح ہوگی، وہ احکاماتِ الٰہیہ اور ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ ان کی پیشانی کشادہ اور نورانی ہوگی۔ سورۃ الفتح نمبر 48، آیت نمبر 29۔ ''تو دیکھتا ہے اُنھیں کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے، طلب گار ہیں اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کے ان کے چہروں پر نور ایمان کے جلوے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے جا ستائش سے بچائے مگر یہ جلوے سوانح نگار کے چہرے پر اس طویل عمری کے باوجود جھلکتے نظر آئیں گے۔

ولی اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بظاہر بڑے بھولے بھالے، دستار و جبہ پہنتے نظر آئیں گے۔ مگر اندر ان کا پلید ہوگا۔ ایسے کئی عیار، فریبی اور دھوکا بازوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ جن حضرات نے دیانت اور امانت کا ثبوت دیا۔ ان کے حسنِ کمال و کردار کے بیان میں پوری فراخ دلی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ بندہ انھیں 57-1956 سے جانتا ہے۔ جب کہ نظامت تعلیمات پنجاب لاہور شعبہ نشر و اشاعت کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ تب سے ان کے اعلیٰ کردار کی شہرت تھی۔ مقبول اکیڈمی کی دن رات ترقی کی وجہ ان کی دیانت، امانت اور صاف ستھرا کاروبار ہی ہے۔

تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا ملکہ عطاء الٰہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو خاص طور پر نعمتیں اس لیے دیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔ جب تک وہ لوگوں کو نفع پہنچاتے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو ان نعمتوں ہی میں رکھتے ہیں اور جب وہ ایسا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے نعمتیں لے کر دوسروں کو دے دیتے ہیں۔"

نشر و اشاعت کے حوالہ سے محترمی جناب ملک صاحب سے مجھے پہلی مرتبہ واسطہ پڑ رہا ہے۔ میری کتاب " لا اُف " جوان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ بڑے اہتمام اور توجہ سے شائع کر رہے ہیں۔ آج جوان اولاد اپنے عمر رسیدہ والدین کی پرورش اور فرماں برداری اس انداز سے نہیں کر رہی جس طرح قرآن وسنت میں بتائی گئی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ جوان اولاد کو ضعیف والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ خود تہی دست ہوں ۔ اسی لیے طباعت و اشاعت پر اُٹھنے والے اخراجات محترمی جناب ملک مقبول احمد صاحب خود برداشت کر رہے ہیں۔ میری طرف سے اُنھیں غیر مشروط اجازت ہے۔ لہٰذا حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کی اس رباعی کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

خداوندا! نگہ داری بلا را
ازیں آفت نگہ داری تو مارا
بحق آں دو گیسوئے محمدؐ
زبوں گرداں زبردستانِ مارا

☆☆☆



مقصود احمد چغتائی

''سفر جاری ہے''

ملک مقبول احمد کی خود نوشت ''سفر جاری ہے'' بڑی دلچسپ اور خوبصورت کتاب ہے۔ ملک صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اپنی دیہاتی زندگی، بچپن، لڑکپن، تعلیم، ملازمت، کاروبار اور ازدواجی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں، زندگی کے تمام مراحل کو بڑی سادگی اور بڑے پیارے انداز میں بیان کر دیا ہے اور پورا سچ لکھ کر اپنی سوانح حیات کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ سچی بات بیان کر دینا بھی ایک خوبی ہے۔ جو ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی کتاب میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ نظر نہیں آتی۔

کتاب میں ملک صاحب نے اپنے مصنفین کا ذکر بھی بڑی محبت، اپنائیت اور احترام سے کیا ہے۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے اور یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس کتاب پر برصغیر کے ممتاز تبصرہ نگاروں نے ملک مقبول احمد کو عصر حاضر کا ذہین مصنف قرار دیا ہے۔ جس کی کاوش کی گونج نہ صرف پاکستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بلکہ دنیا کے کونے کونے تک پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ملک مقبول احمد کو ان کی خوبصورت کاوش پر دلی مبارک دیتے ہوئے اسے نئی صبح کا آفتاب قرار دیا ہے۔ جس کی روشنی سے سارا جہاں چمک اٹھا ہے۔

''سفر جاری ہے'' حسنِ بیان کی سادگی اور بے تکلفانہ انداز میں ادب کا ایک

دلکش مرقع ہے۔ جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ یہ ایک غیر معمولی دستاویز ہے، اس کی اشاعت پر میں مقبول احمد صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆



سید سلمان گیلانی (صدارتی ایوارڈ یافتہ)

نتیجۂ فکر: 487 عباس بلاک مصطفےٰ ٹاؤن

وحدت روڈ لاہور

جناب ملک مقبول صاحب مالک مقبول اکیڈمی لاہور کی محبت اور خلوص کے ساتھ بھیجی ہوئی کتاب خود نوشت ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' برادرم مکرم علامہ عبدالستار عاصم صاحب کے ہاتھوں وصول ہوئی پڑھ کر بے ساختہ کچھ اشعار (ارتجالاً) قلم برداشت ہوئے جوان کی نذر کررہا ہوں۔

''پذیرائی'' کی مزید پذیرائی

یہ جو مقبول اکیڈمی کی ''پذیرائی'' ہے — ہر ادب دوست کو سلماں پسند آئی ہے

اس کی تحریر میں جو ندرت و رعنائی ہے — شاعروں اور ادیبوں کو بہت بھائی ہے

پڑھ کے تحریریں ادیبوں کی مجھے ایسا لگا — ہر کوئی اُس کی محبت کا تمنائی ہے

کتنے اخلاص و محبت سے ملک صاحب نے — عبدالستار کے ہاتھوں مجھے پہنچائی ہے

گو میری اُن سے ملاقات نہیں لیکن اب — ایسا لگتا ہے کہ مدت سے شناسائی ہے

ہے میرے ذوق کی تسکین کا یہ باعث سلمان

ہاتھ میں میرے ''پذیرائی'' ہے تنہائی ہے



رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ

چیئرمین رانا فضل الرحمٰن محمود فاؤنڈیشن پاکستان لاہور

06-01-2010

محترم ملک مقبول صاحب چیئرمین مقبول اکیڈمی لاہور

السلام علیکم!

مزاج گرامی؟

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ جناب عزیزم علامہ عبدالستار عاصم کے ذریعہ ''سفر جاری ہے''، ''پذیرائی''، ''اہل قلم کے خطوط''، ''راہ نوردِ شوق''، ''غزل کے رنگ''، ''پرندہ سفر میں'' اور دیگر کتب وصول ہوئیں۔ آپ کی ذرہ نوازی کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہمیشہ محبتوں میں یاد رکھا۔ میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے حضرت قائداعظمؒ کی شخصیت افکار پر مبنی بے پناہ کتابیں شائع کر کے قوم کو قائد کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔

آپ کی سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' بے حد دلچسپ ہے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیا۔ آپ نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے اور دیگر لوگوں کو بھی اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا پیغام دیا ہے۔ اُن سب کے لئے اس میں ایک سبق ہے کہ اگر سمت درست ہو تو جہد مسلسل سے انسان منزل پالیتا ہے۔ جس طرح آپ نے منزل پالی ہے۔ میں نے اپنے بڑے بیٹے چودھری عبدالرحمٰن خاں کو بھی آپ کی کتاب کا ایک ایک لفظ خود پڑھایا

ہے۔ ''پذیرائی'' میں تو اہل وطن کے منجھے ہوئے دانشوروں نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کر کے کمال کر دیا جناب منشا یاد، جناب اظہر جاوید، جناب اعتبار ساجد، جناب امجد اسلام امجد ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر تنویر صاحب، جان کاشمیری، جناب حمید اختر، سید قاسم محمود، ڈاکٹر صفدر محمود، جناب علی سفیان آفاقی، جناب مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر وحید قریشی جیسے سکہ بند ادیبوں، شاعروں نے آپ کی انمول شخصیت پر تبصرے کر کے آپ کو ادبی تاریخ میں امر کر دیا ہے۔ یقیناً ایسے عظیم لوگوں کی رائے ایک اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اور آپ کے بیٹوں کو علمی، ادبی، مذہبی خدمات کو ہمیشہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

رانا عامر رحمٰن محمود ایڈووکیٹ

ابوالعمار بلال مہدی

84/7-B, G-9/2، اسلام آباد

سفر جاری ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

امید ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے باخیریت ہوں گے۔ میرا آپ سے پہلے بھی قلمی تعارف ہے۔ وہ بھی آپ کی زندگی کے مہ و سال پر خودنوشت عنوانی ''سفر جاری ہے'' جو میرے مہربان دوست صاحب علم وقلم جناب جبار مرزا صاحب کی طرف سے مطالعہ کے لیے ملی۔ محترم جبار صاحب ایسے علم پھیلانے والے انسان ہیں۔ جن کی خواہش ہوتی ہے کہ جو معلومات اُن کے پاس ہیں وہ ہر ایک تک پہنچے۔ وہ اس سلسلہ میں خاصے فیاض ہیں۔

''سفر جاری ہے'' سے معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ ملک کے بہت بڑے اشاعتی ادارہ ''مقبول اکیڈمی'' کا مالک وہ شخص ہے جن کی زندگی کی سرگزشت سامنے آئی ہے۔ میں ''مقبول اکیڈمی'' سے اشاعتی ادارے کی حیثیت سے تو واقف تھا اور اس ادارہ کی چند ایک کتب بھی میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

میرے ذہن میں ''سفر جاری ہے'' سے پہلے صرف ایک اشاعتی ادارہ ہے دیگر اداروں کی طرح جن کا مطمع نظر مالی منفعت ہے اور بس۔۔۔! مذکورہ کتاب کو پڑھ کر ایک ایسا انسان نظر آیا کہ مالی منفعت اس کا وضعی نتیجہ تو ہوگا لیکن اصل مطمع نظر تو صرف اور صرف علم و ادب کی خدمت ہے۔ میرے سامنے ادارہ ہذا کی ۲۰۰۹ء کی مطبوعات کی فہرست ہے۔ جس میں اب تک ۱۳۴۲ سیریز شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ۹۴ سیریز انگریزی زبان میں

ہیں۔اس کے علاوہ یہ سلسلہ جاری اور ساری ہے اور اللہ کرے جاری رہے،ان مذکورہ سیریز میں حمد ونعت، سیرت، تاریخ اسلام، تاریخ پاکستان، کشمیر ادب، اُردو ناول، افسانہ ڈرامہ، نظم ونثر بچوں کی کہانیاں غرض ہر موضوع پر اشاعت کی ہے۔

اس اشاعتی سفر کے سلسلہ میں کتنے علم وادب کے قلم کاروں کو روشناس کرایا، کن کن سے واسطہ ہوا، کئی ایسے بھی قلم کار ہوں گے جن کا ساتھ نہ دیتے تو اُن کی محنت منوں مٹی تلے دب جاتی۔یہ اعزاز بھی اس اکیڈمی کو اور خصوصاً اس کے بانی ورفقاء کار کو ہے۔

یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا کچہ چٹھہ عوام کی عدالت میں پیش کر دے، لیکن الحمدللہ سفر جاری میں ایک ایسا آدمی نظر آتا ہے جو ادیب نہ ہونے کے باوجود خوبصورت اور منجھا ہوا ادیب لگتا ہے تحریر میں بہت چاشنی ہے۔ناول کہیں افسانہ کا رنگ نظر آتا تو کہیں اس انسان کا اصل چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا نظر آتا ہے۔

جو ایک دیہات سے اُٹھتا ہے،اس ماحول کی مکمل تصویر پیش کرتا جاتا ہے۔گاؤں کے کچے پکے مکانات، تالاب وجوہڑ مساجد اور معابد کا ذکر، دیہاتی زندگی کے شب وروز طرزِ معاشرت کو تحریر میں لاتا ہے۔دیہاتی میلوں ٹھیلوں کا ذکر کتنی خوبصورتی سے کرتا ہے۔ کتنا سچائی کے ساتھ اپنے ناکام عشق کا ذکر کرتا ہے،اور اس طرح نہیں کہ عشق کی ناکامی کے بعد کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا بلکہ زندگی بھرپور گزارنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے عائلی زندگی میں ہم سفر کے چناؤ کے لیے وہ ایک تابع فرماں فرزند کی طرح بزرگوں کے آگے سرنگوں ہوتا نظر آتا ہے اور پھر عائلی زندگی کی تلخیوں کے باوجود بھی وہ کہیں حد سے زیادہ غصہ کرنے والا نظر نہیں آتا وہ اپنی پہلی بیوی کو منانے کے لیے بھی پورے صلہ رحمی والے جتن کرتا نظر آتا ہے۔دوسری شادی پر بھی والدہ کا حکم مانتا ہے، کتنی بڑی بات ہے۔

''سفر جاری ہے'' ایک نصف صدی کی تاریخ ہے جس میں گزشتہ اس معاشرہ کی

تصویر پیش کی گئی ہے کہ آج کے دور سے مختلف ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ کوئی خوف ہوتا تھا نہ خطر، لوگ آزادی سے شب و روز گزارتے تھے۔ پھر وہ کیسا خوبصورت منظر تھا کہ جب لوگ میلوں سے واپسی پر جنگل میں بے خطر سو جاتے تھے۔ یہ آج کی نوجوان نسل کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

عرض کتاب میں جہاں دیہاتی اور طبی ٹوٹکے ہیں، وہاں روحانی علاج کے بھی کچھ طریقے موجود ہیں۔ جو غماز میں اس کے کہ مصنف کو اپنے خدا سے کتنا پیار ہے اور اس پر کتنا اعتقاد ہے۔ اس کو زمانہ طالب علمی میں صوفی مقصود احمد کے ذریعے حضرت کرمانوالے سرکار سے کی گئی دُعا کی نوید پر مکمل بھروسہ ہے۔ حتّٰی کہ وہ خط بھی سنبھال کر رکھتا ہے۔ بزرگ اولیاء کے احترام کے لیے اُن کو میاں محمد بخشؒ کی سیف الملوک سے بھی عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔

زندگی کے شعبہ کے چناؤ میں بھی بہت محتاط ہے پٹواری رہا۔ فارسٹ گارڈ کی بجائے وہ تعلیم و تعلم کو ترجیح دیتا ہے۔ کاروباروں کے سلسلہ میں اُن کو بیوروکریسی کے سرخ فیتہ کا بھی تجربہ ہوتا ہے اسی دوران ان کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا بھی تجربہ ہوتا ہے اور وہ بھی جیب تراشی کے بعد، پھر کتنا مطمئن ہے کہ خالی جیب ہونے کے باوجود ہوٹل میں قیام و طعام سے نہیں گھبرایا اور پھر تعلق کی بھی مثال سامنے لاتا ہے کہ اُس کے دوست کتنے اچھے ہیں چونکہ وہ خود اچھا ہے۔

میرے ذہن میں ایک کاروباری ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے جس کا مطمع نظر صرف مالی آمدن و خرچ ہوتا ہے اس پر مالی کمی پر زیر کار لوگوں پر غصہ کرنا اور زیادہ آمدن پر رعب و تکبر کرنا ہوتا ہے بلکہ مجھے ایسا انسان نظر آیا جو گھر کی نوکرانی پر اپنی بیوی کی کام کی سختی پر بھی دکھ کھاتا ہے۔ علاوہ اپنے زیر کار کے ساتھ کیسے حُسن سلوک نہیں کرتا ہوگا۔

غرض اس ساری زندگی کی کامیاب کہانی جس میں جذبہ خودسازی، ہمت و عزم و

حوصلہ جہاں ان کی فطرت کا خاصا ہے۔ وہ بھی اللہ اور اہل اللہ سے محبت، اسلام کے اصولوں پر کاربندی، نماز وروزہ حج کے احکامات کی بجا آوری کے ساتھ یہ سب جن دعاؤں کا اثر ہے۔ وہ صوفیائے کرام کے ساتھ اس کو اپنے والدین کی خدمت اور دُعاؤں سے حاصل ہے۔ ان دُعاؤں کے صدقے وہ زندگی کے حادثات میں بھی بچ نکلتا ہے۔

نہ جانے کون دُعاؤں میں یاد کرتا ہے
میں ڈوبتا ہوں سمندر اُچھال دیتا ہے

مجھے کتاب پڑھ کر سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ کیسا تابع فرماں فرزند ہے جو والدین کو عبادت کی قبولیت کے وقت بھی اُن کو نہیں بھولتا۔ یہی وقت مرحومین کے لیے مغفرت کے اعمال کا ہوتا ہے۔ اگر ان سورائے مبارکہ کے ساتھ ''سورۃ الملک'' کو شامل تلاوت کر لے تو ثواب میں سُرعت ہوگی اور شب جمعہ سورۃ ''دخان'' کی تلاوت بہت روحانی فائدے کی ہے۔

جناب ملک صاحب! میں آپ کو اس خوبصورت ''سفر جاری ہے'' پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، یہ چند ٹوٹے پھوٹے کلمات جو میں نے مطالعہ کے بعد محسوس کئے بغیر کسی امر کے لکھ دیئے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ سفر زندگی جاری رہے۔

☆☆☆

اشفاق احمد وڑائچ

''البشیر''

۳۔ڈی پیپلز کالونی فیصل آباد۔۳۸۰۹۰

چک ۴۴۲ گ ب (سمندری)

15 مارچ 2010ء

محترم ملک صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ !

آپ کی ارسال کردہ کتاب ''سفر جاری ہے'' جو آپ کی آپ بیتی ہے مجھے شام کے وقت ڈاکئے نے پہنچائی۔ مگر اُس وقت رات کے کھانے کے بعد وقت نمازِ عشاء اور بار بار بجلی کی رو کا غائب ہونا، آڑے آیا اور کتاب کو نہ کھول سکا۔ اور پھر اگلی صبح جب اسے لے کر بیٹھ گیا تو جب تک تمام کی تمام ختم نہ کر لی اُس وقت تک دیگر تمام مشغولیتوں اور مصروفیتوں کو معطل کیے رکھا اور جوں جوں کتاب کا اختتام قریب آتا گیا میری تشنگی فزوں تر ہوتی گئی اور دل یہی چاہتا کہ ابھی آپ کی داستان اور جاری رہے۔

ملک صاحب آپ کی کہانی نے مجھے مخمور کر دیا۔ بیان کی سادگی، روانگی اور سلاست جو تصنع اور بناوٹ سے پاک اور عجز، انکساری اور سچی وارداتوں کا مجموعہ ہے نے دل و دماغ کو بہت تراوت بخشی۔ میں کتاب مرتب کرنے پر آپ کو دلی مبارک پیش کرتا ہوں۔

رسول پور بھلّیاں تو صدر سیال کوٹ کے نزدیک تھا وہاں کے باسی چوہدری غلام جیلانی بھلّی (جو کہ قبل تقسیم ملک ذیلدار بھی تھے) ہر روز امیلیا ہوٹل ڈرماں والا چوک (اب علامہ اقبال چوک) کے گیٹ سے ملحقہ پیٹرول پمپ پر باقاعدگی سے بعد دوپہر آ کر

بیٹھا کرتے تھے میں اُن دنوں 50-1949ء میں مرے کالج سیال کوٹ میں فورتھ ائیر میں پڑھتا تھا۔ کالج سے فارغ ہو کر میں لاء کالج لاہور میں داخل ہو گیا اور وہ چوہدری غلام جیلانی بھلّی لائل پور منتقل ہو گئے۔ میں جو اصلاً جلال پور جٹاں ضلع گجرات کا رہنے والا تھا اور میرا زرعی رقبہ لائل پور میں تھا۔ میں بھی وکالت پاس کرنے کے بعد لائل پور منتقل ہو گیا جہاں 1940ء تک وکالت کی جسے اُس کے بعد ترک کر دیا۔ ضمناً چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کی اہلیہ سفیر چوہدری شجاعت حسین کی والدہ بھی اسی رسول پور بھلّیاں کی رہنے والی تھیں۔

اس کتاب کے بارے میں ایک نشان دہی، صفحہ 161 پر ''چند حادثے زندگی کے'' باب میں آپ نے 6 ستمبر 1965ء کو لاہور پر بھارتی حملہ کرنے والے جرنیل کا نام جنرل اروڑہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں کہ تب لاہور پر حملہ کرنے والے بھارتی جرنیل کا نام جنرل چودھری تھا۔ اروڑہ تو وہ جرنیل تھا جس کے آگے 1971ء میں جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے تھے ڈھاکہ میں۔

ایک گزارش: صفحہ 197 پر ''تندرستی ہزار نعمت ہے'' کے ذیل میں ''لوئی کوہنی'' کی کتاب ''نیا علم شفا بخشی'' (یعنی ٹب باتھ سے علاج) اور جو مقبول [illegible] نے چھاپی ہے براہِ کرم مجھے بھی عطا فرمائیں۔

والسلام

احقر

اشفاق احمد وڑائچ

عبدالقیوم
مکان نمبر R-856
محلّہ عید گاہ۔ اٹک شہر

السلام علیکم! اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے!

میں آپ سے بروز جمعرات 8 مئی 2008ء اپنی تین کتابوں کے مسودوں کے ساتھ ملنے آیا تھا۔ اپنی دونوں کتابیں........ ''پیچ و تاب'' اور ''خیالی پلاؤ'' آپ کی نذر کی تھیں۔ جناب نے مجھے اپنی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' سے نوازا تھا جس کے لئے میں بے حد مشکور ہوں۔

میں 9 مئی کو اٹک شہر واپس گھر پہنچ گیا اور پھر 10 مئی کو صبح سے آپ کی کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو مسلسل پڑھ کر شام 4 بجے پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ حالانکہ میں عموماً کتابیں وقفے وقفے سے پڑھتا ہوں۔ بہت کم کتابیں مجھے مسلسل پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ آپ نے جس سادگی، خلوص اور سچائی سے مختصراً حیاتِ مستعار کے شب و روز کو الفاظ میں ڈھالا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے جس طرح آپ نے پنجہ آزمائی کی اور ہمت کی پتوار تھامے رکھی، بالآخر اِسی کے طفیل آپ کی زندگی کی ڈولتی نیّا کامیابی کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہوئی........ حالانکہ ایسے حالات میں کم حوصلہ اور ذہنی اتھل پتھل کی گرفت میں بے بس ہونے والا اکثر دل شکستگی کے ہاتھوں

اپنی حیات کا رخ کسی دوسری جانب موڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔

''سفر جاری ہے'' میں جس طرح آپ ''روشن چہروں'' کے ساتھ خوش وخرم رہے اور ''سیاہ چہروں'' کے مکروہ رویوں سے جس کامیابی سے نپٹے ہیں اور نقصانِ سرمایہ صبر سے برداشت کیا، آپ کے مزاج کے دھیمے پن نے آپ کو دشمنی کی سرحدوں کو چھونے سے محفوظ رکھا کہ آپ کو قادرِ مطلق پر پورا بھروسہ تھا۔ ورنہ ایسے حالات میں کوئی گرم مزاج شخص ایسے واہیات اور مکار ''سیاہ چہروں'' سے الجھ کر سب کچھ داؤ پر لگا دیتا اور مستقبل تاریک کر لیتا۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا تھا ''غصیلے دکاندار کے گڑ پر تو مکھی بھی نہیں بیٹھتی''۔ خداوند تعالیٰ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ وہ نیک لوگوں کی تکلیف کا مداوا کسی اور ذریعے سے کر دیتا ہے........ یہ میرا ایمان ہے!

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''سفر جاری ہے'' کے مصنف نے زندگی کے نشیب وفراز میں ناکامی پر نہ اپنا ذہنی توازن کھویا اور نہ کامیابی کے زعم میں قادرِ مطلق کے کرم کو بھولا۔ اچھے برے لوگوں سے صالح انسانی اقدار کو مدنظر رکھ کر نمٹنے کی وجہ سے قدرت نے انہیں کسی انہونی سے محفوظ رکھا اور توازن مزاجی ہی نے مسند کامیابی ان کا مقدر کر دی!

مخلص

عبدالقیوم

12-5-2008

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ (بھارت)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سفر جاری ہے

''سفر جاری ہے'' پاکستان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے ''مقبول اکیڈمی'' کے مالک ملک مقبول احمد کی خودنوشت ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق کسی بھی ناشر کی اُردو میں یہ پہلی سوانح ہے۔ ملک مقبول احمد کا گزرا ہوا کل، فکر کی بلندی کا آسمان چھوتا ہے اور جن کا آج نقشِ تصویر اور شوق ناتمام کی لامتناہی داستان ہے۔ ملک مقبول احمد کی چھتنار شخصیت علم کا لائحہ عمل طے کرتی ہے، ذوق کی پرداخت کرتی ہے، حوصلے اور عزائم سے سرشار کرتی ہے، بلیغ اور معنویت سے بھرپور منصوبہ بند پیش رفت کرتی ہے، ذوقِ طلب اور شوقِ سفر کے مرحلے کا تصال کراتی ہے، چشمِ تصور کو تابِ نظارہ سے ہمکنار کرتی ہے اور بادِ مخالف میں اُردو کا چراغ روشن کرتی ہے۔ خلوص، محبت، ہمدردی اور شرافت کے مجسم پیکر ملک مقبول احمد خودداری و رواداری اور علم پروری و انکساری کے جوہر سے متصف ہیں۔ علم حاصل کرنے اور علم بانٹنے کا شوق ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت اور علم پروری کی داستان بڑی دلداری، جی داری اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ داری کے ساتھ سنائی ہے جس میں ناول کا مزہ، فلم کا تماشہ اور بہت کچھ سیکھنے جاننے کا گوناگوں برق تجلی ہے۔ یادآفریں واقعات اور تلخ

وشیریں تجربات کا جداگانہ بیان شوق ہے اس لئے بھی کہ شاعروں، ادیبوں اور مصنفین کے ساتھ خود اپنے آپ سے انہوں نے دیانتداری برتی ہے۔

ملک مقبول احمد بہت بڑے ناشر ہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں انہوں نے کتابوں کی اشاعت سے متعلق بعض معنی خیز انکشاف کئے ہیں۔ ان کے تجربے میں صحت مند قدر ہے، گہرا شعور ہے اور واقعاتی سچائی کا آب ورنگ ہے:

''کتاب اس مقصد کے تحت شائع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے مطالب ومفاہیم عام کئے جائیں۔ لہٰذا کتاب کا ناشر ایک کتب فروش کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔ میں یہ فریضہ کئی برسوں سے ادا کر رہا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اس کام سے روزی کمانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے یا جس کا تصور کیا جاتا ہے۔ کتاب سازی کو تخلیقی عمل سے بھی تشبیہ دی گئی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ تخلیقی عمل میں کس قدر دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔''

حقیقی احساس وعرفان سے کام لے کر دانش وبینش کی نئی معنویت کو ملک مقبول احمد تفسیری عمل سے گزارتے ہیں اور کتابوں کی دنیا کے گہرے سمندر میں غواصی کر کے سیپیاں تلاش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی نامور اور غیر معروف قلمکاروں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں خوبصورت خیالات کی وجہ سے متنوع الموضوعات کی جلتی شمع ہے اور اُمید کے جگنو بھی ہیں۔

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ (بھارت)

روزنامہ پاکستان

22-11-2009

.

.

سفر جاری ہے

''سفر جاری ہے'' نامور پبلشر اور مصنف ملک مقبول احمد کی خودنوشت ہے۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے جس کا دوسرا ایڈیشن زیرنظر ہے، اپنی زندگی کے حالات وواقعات دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ ان کی اس خودنوشت کے مطالعہ کے بعد نامور مصنف اور تاریخ پاکستان کے راہی ڈاکٹر صفدر محمود کے اس تبصرے پر یقین آجاتا ہے کہ ملک مقبول احمد صرف کتب شائع نہیں کرتے، بلکہ کتابیں ان کے اندر......دل میں......بستی ہیں۔ علی سفیان آفاقی کا خیال ہے کہ ملک صاحب نے اس تصنیف کے ذریعے کاروباری گر بیان کردیے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق کتاب میں کسی زیب داستان سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ ایک صاحب نے اپنی زندگی کو انکسار اور صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بلاشبہ ملک مقبول احمد کی آپ بیتی میں ''جگ بیتی'' کی چاشنی بھی ہے۔ وہ ایک رومان پرور ادیب ہیں۔ شعیب بن عزیز کے بقول ملک صاحب نے زندگی کی راہ کے کانٹے اپنی پلکوں سے چنے ہیں۔ وہ انسانیت کے دلدادہ ہیں، انسانیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور نہ ہی جھوٹی انا کی پرورش کی ہے۔ ان کی انسان دوستی، اللہ کے بندوں سے خوب راہ ورسم کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک سے زائد بار اپنے گھر بلایا

اور روضہ رسول ﷺ کی زیارت سے سرفراز فرمایا۔

کتاب خوبصورتی سے مضبوط جلد میں پیش کی گئی ہے اور ہر نوع کی مہنگائی کے دور میں قیمت مہنگی نہیں ہوتی۔

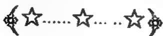


نوائے وقت

13-7-08

سفر جاری ہے

افسانے اور سفرنامے کی مقبولیت کے دور میں ''خودنوشت سوانح عمری'' پڑھنے کا رجحان روز افزوں ہے تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عام لوگ حقیقی زندگی کے مشاہدات کے مطالعے میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ دیکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے زندگی میں نامساعد حالات کے باوجود کامیابی کس طرح حاصل کی۔ ملک مقبول احمد کو بھی ایک ایسا فرد وحید شمار کرنا چاہیے جس نے اشاعتی دنیا میں نام پیدا کیا اور اپنی داستان ''سفر جاری ہے'' کے نام سے پیش کر دی۔ یہ کتاب جنوری 2007ء میں چھپی تھی اور اسے اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ اس کتاب پر اظہار رائے کرنے والوں کے مضامین پر مشتمل ایک نئی کتاب معرض وجود میں آ گئی ملک صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اس کتاب میں ان مصنفین کے خطوط اور تذکرہ بھی شامل کر دیا جن کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے چھپی تھیں گویا ان کی سوانح عمری میں حدیث دیگراں اور ان کے ادارے کی کتابوں پر تبصرے بھی شامل تھے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اب زیر نظر ہے تو اس میں ملک مقبول احمد نے صرف اپنا زندگی نامہ پیش کیا ہے جوان کی محنت و مشقت اور عملی زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنے کی داستان ہے۔ گویا اب یہ کتاب ان کی ذاتی سوانح تک محدود ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سوانح افسانے سے کم دلچسپ نہیں اسے پڑھنا شروع کریں تو پوری کتاب پڑھے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔



سفر جاری ہے

''میں تو ملک مقبول احمد صاحب کو صرف ایک شریف النفس انسان اور ایک معروف اشاعتی ادارے کے مالک کی حیثیت سے ہی جانتا تھا لیکن اُن کی خودنوشت سوانح عمری کے مسودے کی ورق گردانی کی تو یہ راز کھلا کہ ملک صاحب صرف کتابیں چھاپتے نہیں بلکہ کتابیں اُن کے اندر بھی بستی ہیں۔ وہ پبلشر ہونے کے باوجود کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی محبت کی ایک اہم کڑی اُن کی زیر نظر تصنیف ''سفر جاری ہے'' جس میں گوناگوں تجربات، حوادث اور مشاہدات اور ملک صاحب کا نہایت دلچسپ اُسلوب اور منفرد انداز تحریر اس کتاب کو سوانح عمریوں میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت بخش رہے ہیں۔'' ڈاکٹر صفدر محمود

''یہ کتاب پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مقبول صاحب کی زندگی بھی افسانے سے کسی طرح کم نہیں ۔ انہیں مشکلات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا مگر اُنہوں نے صدقات، دیانت اور امانت کے اصولوں کو قائم رکھا، خود محنت کی اور نتائج خدا پر چھوڑ دیئے۔ اس کتاب کا باب ''وکھری ٹائپ کے لوگ'' معاشرے کا حقیقی روپ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملک مقبول صاحب نے ہر طرح کے لوگوں سے روابط کا سلسلہ کس طرح قائم رکھا اور آبگینوں کو ٹھیس لگنے سے کس طرح بچایا۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ''زیب داستان'' سے کام نہیں لیا گیا۔'' ڈاکٹر انور سدید

ملک مقبول صاحب نے خودنوشت تحریر کر کے اپنی زندگی کے دلچسپ اور معلومات آفرین واقعات سے روشناس کرایا ہے۔ ایک اچھا نا شر وہی کہلاتا ہے جس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہو اور وہ انسانی نفسیات پر بھی عبور رکھتا ہو۔ ملک مقبول احمد کی تحریر سُلجھی ہوئی شستہ اور رواں ہے جس میں جا بجا ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے ثبوت نظر آتے ہیں۔'' علی سفیان آفاقی

''سفر جاری ہے'' آپ بیتی کی مسلمہ تعریف پر پورا اترتی ہے۔ ملک مقبول احمد نے بچپن سے لے کر موجودہ عمر تک زندگی کے احوال، یاد آفریں واقعات اور تلخ وشیریں تجربات کے بیان پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اہم حصہ اُس عرصے پر محیط ہے جس کا تعلق ملک صاحب کے بچپن، جوانی اور عملی زندگی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ یہ عرصہ حیات اُن کے گاؤں ''دیووال'' سے جڑا ہوا ہے جس کے بیان میں ملک مقبول احمد صاحب نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'' ڈاکٹر طارق عزیز

''میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ملک مقبول احمد ''گرم دم جستجو اور نرم دم گفتگو'' والے انسان ہیں ان کا رابطہ ہر قسم کے ادیبوں اور شاعروں سے پڑا جس کا تذکرہ زیرِ نظر کتاب میں موجود ہے۔ فطرتاً ملک صاحب ''خیالِ خاطرِ احباب'' رکھنے والے انسان ہیں جس کے باعث انہوں نے عملی زندگی میں اور نہ زیرِ نظر کتاب میں انسانیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔'' شعیب بن عزیز



حصہ دوم

پذیرائی

فہرست

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور

اکتوبر 2008ء

پذیرائی

اپنی نوعیت اور حیثیت کی یہ منفرد کتاب ہے...... ہوا یوں، ملک مقبول احمد، کہ جو مشہور ناشر اور بے حد ادب دوست، وضع دار اور بامروت شخص ہیں، انہوں نے اپنی سوانح عمری لکھی اور چھپوائی...... ''سفر جاری ہے......'' کچھ آپ بیتیاں اپنے جھوٹ، فرضی معاشقوں اور اپنی ذات کو قد آور بت بنا کر باقی سب کو بونے ثابت کرنے کے سلسلے میں مشہور ہوئیں، 'سفر جاری ہے' نے اپنی سادہ زبان، کھلے ڈھلے اظہار اور سچ اور خالص سچ کے بیان کی وجہ سے مقبولیت اور پذیرائی کی انتہا کر دی...... شاید ہی کوئی اہلِ نظر ادیب ہو، جس نے کتاب پڑھنے کے بعد دیانت اور غیر جانب داری سے رائے نہ دی ہو۔ پذیرائی، انہی آراء، تبصروں اور مکتوبات کا مجموعہ ہے اور باتصویر مجموعہ...... جیسے کبھی الف لیلہ اور قصہ ہیر رانجھا باتصویر ہوا کرتے تھے۔ اس میں تمام رائے دہندگان کی تصاویر معہ تعارفی سطور کے شامل ہیں۔

یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے، ''پذیرائی'' میں پاکستان (اور ہندوستان کے بھی) تمام قابل ذکر اور لائق فخر اہل قلم نے مقبول احمد کی کتاب ہی نہیں ان کی شخصیت کو بھی سراہا ہے۔ یہ کسی انسان کی خوش بختی ہے، جیتے جی اسے اتنے چاہنے سراہنے والے مل گئے ہیں۔ یہاں تو لوگ قلم گھسا گھسا کر خود گھس جاتے ہیں اور بہتر اور جامع کام بھی کرتے ہیں، مگر......

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

خدا، ملک مقبول احمد کو نظر بد اور حسد سے بچا کے رکھے۔ آمین۔ کتاب سفید کاغذ پر عمدہ چھپی ہے اور سرورق بھی منفرد ہے۔



ہفت روزہ ''ندائے ملت''

اعتبار ساجد

پذیرائی

ایک کتاب جس کا قرض ملک مقبول احمد کی طرف سے مجھ پر واجب ہے وہ ''پذیرائی'' ہے۔ ''پذیرائی'' ملک صاحب جیسی علمی وادبی قدآور شخصیت پر لکھے جانے والے ان تاثرات اور مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک صاحب کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کے مطالعے کے بعد مقتدر اہل قلم نے تحریر کیئے اور سچ یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے تخلیق کیئے۔ ہر مضمون اور ہر تحریر اس قابل ہے کہ بار بار اس کا مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ اس میں ایک سیلف میڈ انسان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں بے شمار قابل احترام پبلشر موجود ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند ایک ہی صاحبِ قلم ہیں۔ ان چند ایک میں ملک مقبول احمد سرفہرست ہیں۔ ان کا انکسار، معاملہ فہمی، علم وادب کے لئے ان کا ایثار اور جدو جہد ناقابل فراموش ہیں۔ ایسے لوگ کسی معاشرے کے علمی و ادبی افق کا جھومر ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب بابر مقبول، اکبر مقبول، عاصمہ مقبول، مدیحہ مقبول، ارم مقبول، بینا وحید اور ماریہ وحید کے نام ہے جن سے مصنف نے اپنی امیدیں وابستہ کی ہیں اور جن کی کامیابی اور فلاح دنیوی وروحانی کے لئے دعا کی ہے۔ 462 صفحے کی اِس کتاب میں تقریباً 87 سے زائد اہل قلم کی خوبصورت اور یادگاری تحریریں اور تصویریں شامل ہیں۔ مقبول اکیڈمی نے اس بات کا ممکنہ خیال رکھا ہے کہ ہر صاحب الرائے کی تصویر اور تعارف بھی اس کی تحریر کے ساتھ شامل کیا جائے۔

اس طرح یہ ایک اہم یادگار دستاویز بن جاتی ہے جہاں ایک چراغ روشن ملک مقبول احمد نے سینکڑوں دیئے جلا دیئے ہیں۔ میں خلوصِ دل سے سمجھتا ہوں کہ اُدب کے طالب علموں اور خصوصاً تشنگانِ علم کے لئے اس کتاب کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک فردِ واحد کی داستانِ حیات کو خراجِ عقیدت کے مہکتے ہوئے پھول ہیں، مگر اس سے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ زندگی مسلسل سفر کا نام ہے اور جو لوگ ناکامیاں سہنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، دراصل کامیابیاں بھی انہی کا مقدر ہوتی ہیں۔ اس کتاب پر فوری تاثر کے طور پر یقیناً یہ سطور ناکافی سمجھتا ہوں اور ملک صاحب کا قرض جوں کا توں اپنے دل و جاں پر محسوس کرتا ہوں، لیکن یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ کن حالات میں یہ سطریں تحریر کی جا رہی ہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار ملک و ملت کو امن اور شانتی کی راہ پر گامزن رکھے۔ ہمارے آفاق وسیع ہوں، ہمارے پھول کھلیں، ہمارے پرندے چہچہائیں، ہمارے کھیت اور باغ ہرے بھرے رہیں اور ہمارے ادارے ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' جیسی کتابوں کی اشاعت سے ہمارے علم و عرفان میں اضافہ کرتے رہیں۔ آمین!



اعتبار ساجد

158۔ علامہ اقبال روڈ، چوک گڑھی شاہو لاہور

ملک مقبول احمد

پاکستان میں جدید ترین پرنٹنگ، پبلشنگ کے ماہر ادیب، مدیر اور دانشور

ہمارے ملک میں بے شمار اشاعتی ادارے ہیں۔ جن کے مالکان کے مختلف مزاج اور کتابوں کے مختلف معیار ہیں لیکن یہ بات عالمی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ پاکستان میں گزشتہ چند دہائیوں کے مقابلے میں نہ صرف اشاعتی معیار میں حیران کن تبدیلیاں آئی ہیں بلکہ اب پاکستان معیارِ اشاعت اور مواد کی پختگی کے لحاظ سے دنیا کے متمدن ترین ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ بات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پاکستان میں شرح خواندگی کی صورت حال کو سنبھالا دینے میں ہمارے وہ چند اشاعتی ادارے بھی شامل ہیں جو اشاعتِ کتب کو کاروبار نہیں عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ ان اداروں میں حاجی ملک مقبول احمد کا ادارہ مقبول اکیڈمی بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

ملک صاحب گاؤں دیووال سیالکوٹ کی ایک معزز اعوان برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتہائی شائستہ، منکسر المزاج اور ہر معاملے میں کھرے انسان ہیں۔ انہوں نے پاکستان بھر کے بے شمار نامور ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور کالم نگاروں کی انتہائی دقیع اور خوبصورت کتابیں شائع کی ہیں۔ ملک مقبول احمد نہ صرف پبلشر ہیں بلکہ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں اور ایک ذہین وفطین صاحبِ مطالعہ شخص ہیں۔ ان کی خود

نوشت سرگزشت ''سفر جاری ہے''۔اگر چہ ایک مخلص، ایماندار اور سادہ دل انسان کی ترقیوں، کامرانیوں، ناکامیوں اور عزت افزائیوں کی داستان ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس کتاب میں جتنا سچ انہوں نے بولا ہے وہ سعادت اُردو کے بہت کم ادیبوں اور دانشوروں کے حصے میں آئی ہے۔انہوں نے کتاب کے آغاز ہی میں ژاں ژاک رُوسو کا ایک اقتباس درج کر دیا ہے جو، ان کی ذات کی سچائی کا مظہر ہے۔اقتباس یہ ہے:

''میں نے ہر وہ بات جو کہ قابلِ تعریف یا قابلِ اعتراض تھی، پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے۔میں جیسا تھا خود کو دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا۔''

انہوں نے دیووال سیالکوٹ سے اوائل عمری میں عملی زندگی کا آغاز کیا اور پھر لاہور آ کر رسالہ ''چودھویں صدی'' سے اشاعتی دنیا میں قدم رکھا۔سرمائے کی کمی، دن رات کی انتھک محنت نے ان کی صحت پر بھی اثر ڈالا۔مگر وہ اپنی دھن میں لگے رہے۔بالآخر ایک دن مقبول اکیڈمی وجود میں آ گئی۔کسی اشاعتی ادارے کا وجود میں آنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس ادارے کا معیارِ اشاعت کیا ہے۔اس کے ادیبوں اور دانشوروں کی علمی و ادبی سطح کیا ہے۔اس سلسلے میں ملک مقبول احمد نے جان توڑ کوشش کی۔معیار کے سلسلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی نادر کتب کے حصول میں انگنت مالی تکالیف برداشت کیں لیکن اپنے نیک مقصد میں اس لئے کامیاب رہے کہ رب العزت ہمیشہ اسے سرخرو کرتا ہے جس کی نیت نیک اور ارادے نیک ہوں۔

ملک مقبول احمد نے سچائی اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے ''سفر جاری ہے'' کے آغاز ہی میں اعتراف کر لیا ہے کہ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم، کوئی جھجک، کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ میں تعلیمی سرٹیفکیٹوں، ڈگریوں اور دستاویزی حوالے سے

انتہائی کم علم ہوں لیکن پھولوں کے درمیان رہ کر خوشبودار ہو جانے والی مٹی کی طرح میں بھی ادباء، شعراء، مصنفین اور مترجمین و معلمین، محققین اور عالی ظرف انسانوں کے داخلی جمال سے فیض یاب ہوا۔"

حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب کسی اونچی سطح پر پہنچ جائیں تو وہ کبھی اپنی زندگی کی ناہمواریوں یا کم علمی کا اعتراف نہیں کرتے لیکن ملک صاحب نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی زندگی اتنے سچے اور اتنے دل گداز انداز میں بیان کی ہے کہ جنہوں نے آج تک ملک صاحب کو نہیں دیکھا انہیں بھی یہ خودنوشت داستان پڑھ کر ملک صاحب سے ایک دلی اُنس اور روحانی پیار ہو جاتا ہے۔ کتابیں ہمارے ہاں ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں چھپتی ہیں۔ اور ماشاءاللہ ان میں سے بیشتر کو پذیرائی بھی ملتی ہے لیکن جتنی اور جیسی پذیرائی ملک صاحب کو ملی اتنی اور ایسی پذیرائی بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ ملک بھر کے اخبارات و جرائد کے کالم نگاروں نے ان پر کالم لکھے۔ ادیبوں نے خوبصورت اور اثر انگیز مضامین لکھے جو انتہائی دیدہ زیب اور ضخیم کتاب "پذیرائی" کی شکل میں اس وقت ملک اور بیرون ملک کے سینکڑوں تشنگان علم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کتاب محض تعریف و توصیف پر مشتمل مواد کا مجموعہ نہیں بلکہ حقیقتاً درجنوں صاحب علم و دانش کے دل سے نکلی ہوئی محبت بھری آواز ہے جو لفظوں میں ڈھل کر کتاب کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بے شمار چینلز کی موجودگی اور مضبوط الیکٹرانک میڈیا کی مسلسل پرکشش نشریات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز کتابوں کی بجائے ٹیلی ویژن کی سکرین بن چکی ہے لیکن ان تمام حقائق کے باوجود علم سے محبت رکھنے والے بھی موجود ہیں اور وہ کتاب کے لئے وقت ضرور نکالتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کتاب کے بعد کتاب کی پذیرائی نہ ہوتی۔ ملک صاحب نے بچوں کے ادب پر بھی بہت کام کیا ہے۔

کتابوں کے ڈیزائن ان کے معیار، ان کے مواد اور سب سے زیادہ زبان کی سادگی پر زور دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' اتنی سادہ، دلکش اور زود اثر ہے کہ فوراً دل پر اثر کرتی ہے، کوئی شخص ایک بار کتاب شروع کر دے، ہمارا دعویٰ ہے کہ جب تک وہ کتاب ختم نہیں کر لیتا اسے ہاتھ سے نہیں رکھے گا۔ کسی کتاب اور صاحبِ کتاب کی اس عہد میں تین چیزوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اول نیک نیتی، دوم صاف گوئی، سوم مخلصانہ معاملات اور سچے تعلقات۔

ان سب کے پیچھے ظاہر ہے ایک ہی شخصیت ہے اور اس دلکش اور من موہنی شخصیت کا نام ہے۔ ملک مقبول احمد۔



پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

یکم رمضان المبارک 1430ھ

گرامی محترم جناب ملک مقبول احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اُمید ہے آپ ہر طرح سے مع الخیر اور خوش وخرم ہوں گے۔ رمضان المبارک کی آمد مبارک ہو۔ آپ سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کی طرف سے فدوی کی عزت افزائی اور کرم فرمائی پر شکریہ ادا کرنا واجب تھا۔ اسی سلسلے میں حاضر ہوں۔ امید ہے کہ میری آمد کو بے وقت اور خوامخواہ خیال نہ کریں گے۔

اگر میں یہ کہوں کہ نیکوکاروں اور اولیاء اللہ کا ''فیض'' بعد از مرگ بھی جاری رہتا ہے تو کچھ بعید نہ ہوگا۔ میں کہیں ایک سال کے بعد اپنے کالج کی لائبریری گیا تو وہاں سے ''شاہ ولی اللہ اور علم حدیث'' مولفہ ڈاکٹر ایم ایس ناز ہاتھ آئی۔ پہلے تو گھر لا کر اس کی ورق گردانی کی پھر اس کی تلاش میں نکلے تو کشاں کشاں ''مقبول اکیڈمی'' پر حاضری ہوئی۔ وہاں اپنے ایک مربی اور محترم شبیر احمد خان میواتی سے ملاقات ہوگئی۔ کتاب کا پوچھا تو کتاب تو نہ ملی مگر صاحب کتاب ڈاکٹر ایم ایس ناز صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ پھر چند منٹ کی مختصر ملاقات ایک مشفق اور علم پرور صاحب سے ہوئی اور وہ تھے آپ یعنی ملک مقبول احمد، آپ نے ''سفر جاری ہے'' کا تحفہ دیا تو میں تبصرہ لکھنے پر مجبور ہوگیا۔ تبصرہ کی ایک نقل آپ کو بھجوائی تو راہ و رسم بڑھے۔ دوبارہ ملاقات ہوئی تو ''پذیرائی'' سے پذیرائی کی گئی۔ ''راہ نوردِ شوق'' سے نوازا گیا اور میں ''اجتہادی اختلافات'' کی خواہش کر بیٹھا تو اختلافات بھی میرے فریطۂ علمی میں ڈال دیئے گئے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

یہ سب حضرت شاہ ولی اللہؒ اور علم حدیث کی کرامت ہے۔

کچھ لوگ صرف رہنمائی کرتے ہیں انگلی پکڑتے ہیں نشان منزل دکھاتے ہیں اور پھر بیچ میں سے نکل جاتے ہیں۔گرامی قدر جناب شبیر احمد خان میواتی صاحب نے کچھ یہی کردار ادا کیا ہے۔مجھے آپ سے ملایا، خود نکل گئے گویا شجر سایہ دار اور پھل دینے والے درخت کے پاس مجھے لا چھوڑا کہ فیض اٹھاؤ اور ہمیں یاد رکھو! میں تو منتظر ہوں۔

اور کیا کیا دکھائیں گے شبیر
شفقت کیا کیا دکھائیں گے شبیر

اگرچہ ''سفر جاری ہے'' میں نے بھی پڑھی۔مگر ''سفر جاری ہے'' کا جو مطالعہ ''پذیرائی'' کے ذریعے ہوا وہ شاید میں پہلے نہ کر سکا تھا۔''پذیرائی'' میں تو پذیرائیاں ہیں، محبتیں ہیں، آشنائیاں ہیں، چاہتیں ہیں، ہمہ گیریاں ہیں، راحتیں ہیں، قلم فرسائیاں ہیں اور تجزیے ہیں۔تعلق نمائیاں ہیں، مشاہدے ہیں، قلم ہیں کہ رواں ہیں، خیالات ہیں کہ فرواں ہیں، مشاہدات ہیں کہ گیرائی آمیز ہیں، نوادرات ہی نوادرات، تبصرے ہی تبصرے، مکالمے ہی مکالمے، گویا ملک صاحب کے ''حلقہ یاراں'' میں سب ''بریشم کی طرح نرم'' ہیں۔کیونکہ ملک صاحب خود بھی نرم دم، میٹھی گفتگو کے حامل اور دل پذیر شخصیت کے مالک ہیں۔

''پذیرائی'' میں پیش لفظ اور دیباچے کو چھوڑ کر چوراسی ''زعما'' کے خیالات ... شحات قلمی اور تبصراتِ نقدی ہیں۔ان میں ادیب بھی ہیں، قلمکار بھی، معلمین بھی ہیں......نگار بھی، مؤرخ بھی ہیں تجزیہ کار بھی، بیوروکریٹ بھی ہیں ریٹائرڈ بے کار بھی، قلم وقرطاس کے حاملین بھی ہیں اور کتاب کے یار بھی، مصنفین بھی ہیں اور محققین بھی، مدبرین بھی ہیں اور مفسرین بھی۔گویا محبت کے اس انبوہ میں سب اپنے اپنے تعلق، محبت اور قلم

کے تحفے لئے حاضر ہیں گویا زبان حال سے نغمہ گو ہیں۔

ہم بھی تمہارے دوست ہیں ہم کو بھی ''چاہیے''
تیری نگاہ شوق کی ایک جھلک ''چاہیے''

ملک صاحب نے بھی ایک ایک دوست اور مربی کے ''تعارف'' کا حق ادا کر دیا۔ تصویریں تو گویا سونے پر سہاگہ ہے۔ پتوں اور فون نمبرز کا نہ ہونا ملک صاحب کی ''سفر جاری ہے'' کے بارے میں مجھے ''پذیرائی'' کے بغیر حقیقی جانکاری ہو ہی نہ سکتی تھی۔ البتہ کھٹکھٹا ہے!!! ہر آدمی کا طریق مطالعہ الگ الگ ہے اور پھر اس کو جانچنا، پرکھنا، پھٹکنا، اس کا معیار اور زاویہ بھی الگ الگ ہے مجھے یہ سب یکجا فوائد ''پذیرائی'' سے حاصل ہوئے۔

اخبارات و جرائد کے تبصرے ''اضافہ'' یا تاکید مزید ہیں۔ اور یہ مہر قبولیت ہے ''سفر جاری ہے'' کے لئے۔ ایک بہت دلچسپ اور نادر بات جو میں نے ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' سے حاصل کی۔ وہ ہے ''خودنوشتوں'' کی ایک طویل فہرست، یہ ایک علمی بات بھی ہے اور ''خودنوشت'' کے محققین کے لئے حوالہ برائے مطالعہ بھی۔ یہ فہرست ان شاء اللہ! میں ملک صاحب کو بوقت ملاقات پیش کروں گا۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

The Journey continues

Dr. Amjad Parvez

It is fine if one prints a book on compilation of diverse comments on one's previous work but keeping its . It is so with Malik Maqbool Ahmad whose book titled "*Pazeerai*" that means '*appreciation*' has appeared recently. In terms of business, appreciation means increase in the value of an asset through a rise in market price, appraised value, or income earned, as compared to an earlier period. Malik Saheb's book under review is therefore appreciation or income earned in kind (not in coin) on his earlier work, an autobiography titled '*Safar Jari Hai*'. He has dedicated this book to his children and grandchildren.

One aspect that comes to light after reading this book is that Malik Saheb really respects the community of writer, poets and intellectuals from the core of his heart despite the fact that he is a businessman and his job is to earn from publishing books. Mansha Yaad, the famous short story writer states in his prologue to the book titled "*Khushboo Ki Tarah Pazeerai*" writes about a personal experience of getting a book free of cost from Malik Maqbool's office in Urdu Bazar, Lahore once on the pretext of the publisher that since it was for the first time that Mansha had visited that office, so the book was a gift. It may be noted that Mansha had not met Malik Maqbool Ahmad till then. This instance reaffirms this reviewer's belief that a writer should also be a good person at heart.

If otherwise, his intellectual output would appear as deception. Another instance is that of Hameed Kashmiri who after receiving the book from Maqbool Academy also received the money order returned for the book he had purchased. He was impressed with this goodwill gesture. Many such instances have been quoted by Mansha Yaad in his prologue to the book under review.

Mansha Yaad adds that it was through Dr. Anwar Sadeed that he had received the book "Safar Jari Hai" and since he was writing his own autobiography at that time, he learnt from and had appreciated the frankness, honest and simplicity of expression. He states that he has the capability of find the voice behind the books that appear calm on the face of it. Special feature that impressed him was Malik Saheb's admitting that though he did not have much educational qualifications to boast about, his association with men of letters had developed in him the quality of judging their innerselves. Aitbar Sajid, the poet cum short story writer reaffirms the quality of simplicity in Malik Saheb as there was not an iota of singing one's own praises in his autobiography. It was the author's love for literature and for those who write it, which had developed the passion in Malik Saheb to become a publisher. It means that publishing books is not just a matter of bread and butter for him.

All eighty four writers and eight newspaper reviews included in the book under review who has given their opinions on Malik Maqbool's autobiography "*Safar Jaari Hei*" converge to one point that contrary to the

general belief on the configuration of autobiography, one tends to believe that whatever the writer is sharing with his readers, is true. In a write-up printed in the daily Nawa-e- Waqt on February 02,2007 writer Dr. Anwar Sadeed says that the autobiography since has not been written by a professional writer, makes it believable. Dr Akhtar Shumar, Chairman Urdu department, FCC University and a famous poet opines that if one opens any page of the book one finds the author's love for humanity, hard work and struggle and above all possessing a loving heart. Israr Zaidi a veteran guide to many writers reveals that he came to know of the publishing house run by the author through his friend Mirza Adeeb three and a half decade ago. He came to now that Malik Saheb exactly knew what his prospective writers would be writing on or about. About straight forward and honest dealings of Malik Saheb, Israr Zaidi states that after the printing of his novels "*Sindbaad Jahazi Ka Aathwan Safar*" and "*Samundari Shehzada*" Malik Saheb paid him three times without him soliciting. After reading the autobiography Zaidi quotes the couplet of Aatish "*Safar Hai Shart Musafir Nawaz Buhtairey/Hazarha Shajar-e-Saayadaar Raah Mein Hei*" in appreciation. Akbar Hameedi, the poet, Inshaiya writer and sketch writer states that since he belonged to a village he found the simplicity of expression in the autobiography that is a forte of villagers devoid of diplomacy...

Apart from writers and poets, people belonging to other professions have also written on Malik Maqbool's

autobiography. Dr. Allah Bukhsh Malik, an economist and social worker states the autobiography is a story of continuous struggle. He feels that there is a magical touch in Malik's personality. He had the usual ups and downs in his life but he came out victorious from all the adversities. Poet and writer Amjad Islam Amjad states that Malik Saheb has written his autobiogrphy in a simple and unconventional manner. This reviewer's comments in the Book Review on the autobiography printed in the daily Nation, Lahore on August 19,2007 suggests to the younger generation to go through this book to learn lessons from the way the author led his life. Writer Amina Ambreen declares this book as a story of a simple mission and in the process won the prayers of his mother, love of his children and friends. Educationist Annes Yaqub says that the autobiography is a story of a person full in action who has tasted both the sweet and harsh attitudes of people.

Novelist, short story writer and travelogue writer A. Hameed remembers the initial days of the author in his old office located in Shahalmi Gate where a curly black haired man would welcome his and ask whether he had brought some new material for him. A. Hameed praises the extra ordinary care taken by the author regardin publishing quality. He says that this publisher's printed book fifty years ago on Litho printing beat even the offset printed books of today.

Engineer cum Ghazal Sayer Baqi Ahmadpuri quotes a couplet "*Aik Aik Lamhey Ki Tasweer Bani Hei Dil Par/Yah Na Samjho Keh Mujhey Yaad Nahhin Hei Kutch*

Bhi" as a tribute to Malik Saheb. Views of Badar Munir, Bashir Mujid, Bilquis Riaz, Parto Raheela, Tanvir Hussain, Suraiya Khurshid, Jan Kashmiri, Javed Akhtar Bhatti, Jamil Azar, Joginder Pal, Hafiz Sufwan Ahmad Chohan, Hamid Hasan Hamid, Hazin Kashmiri, and Khwaja Muhammad Zakariya have also been included in the book.

Dr. Rasheed Amjad States that from page 51 to 173, the author divided his life of childhood, youth and struggle thereafter. By doing so, entering into unnecessary details have been avoided. Dr. Riaz Ahmad who has held positions of District and Session Judge and has authored the book titled "The concept of Administrative Accountability in Islam' says that the autobiography is the "*Tafseer*" of the Ayaats "*Layas LilInsaan Illa Masaee*" and "*Ma'al LilInsaan Matamana*". Zahid Hussain Anjum is known as the effort behind authoring the Quaid-e-Azam encyclopedia in Pakistan says that it was Malik Maqbool who made Anjum's book look beautiful. Professor Sajjad Naqvi, a veteran intellectual from Sargodha after reading the autobiography remembered professor Ghulam Jillani who used to take the best out of all the situations encounted in his life. That is why Malik Saheb's attempt can be attributed to the sense behind the couplet "*Kheyal-e-Khatir-e-Ehbaab Chahiye Har Dum/Anis Thais Na Lag Jaey Aabginon Ko*". It is not possible to give the views of other writers on the autobiography but it shall suffice to give their names which are Salma Siddiqui, Saeed Badar, Syed Qasim Mahmud, Syed Meraj Nayyar,

Tariq Shaheen, Tariq Ismail Sagar, Ali Sufyan Aafaqi, Qayem Naqvi, Munawar Usmani, Miskeen Ali Hijazi, Dr. Wazir Agha and many other intellectuals. In the end this reviewer shall borrow the words of the daily Dawn reviewer who says that the author has managed to pen a ripping account with utmost candidness. It not only reflects his own personality but also serves as a running commentary on the cultural and literary activities of his times. By and large the people who offered their comments on Malik Maqbool's book feel that both the publisher and writer therefore appear as one entity.

Daily Nation Lahore



نوائے وقت

انور سدید

پذیرائی

لاہور کے ممتاز اشاعتی ادارہ مقبول اکیڈمی کے سربراہ ملک مقبول احمد کی دوسری نسل کے بچوں نے جب ان کے زمانے کے واقعات ان کی زبانی سنے تو بابر، اکبر، عاصمہ اور مدیحہ نے ان سے تقاضا شروع کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کی کہانی قلم بند بھی کر دیں۔ دادا نے ان کے تقاضے کو پورا کیا اور اپنی پوری سوانح حیات لکھ دی جو سیالکوٹ کے ایک گاؤں سے شروع ہوئی تھی۔ ملک مقبول احمد کے بچپن کی شرارتوں اور مجسموں کی عکاس تھی۔ اس میں جوانی کی دیوانگی کا ذکر تھا اور ماہنامہ ''چودھویں صدی'' کی اشاعت کے بعد کتابوں کی نشرو اشاعت کی طرف رغبت۔ ابتدا اور ارتقا کا تذکرہ تھا۔ اس عرصے میں ان کا نشرو اشاعت اور خرید و فروخت کتب کے لوگوں سے ہی واسطہ نہ پڑا بلکہ بیسیوں ادیبوں کی کتابیں چھاپنے اور ان کی قربت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ میں نے جب ان کی سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' دیکھی تو محسوس کیا کہ یہ کتاب ملک مقبول احمد نے اکیلے نہیں لکھی بلکہ اس میں مقبول اکادمی سے تعاون کرنے والے سب ادبائے کرام شریک ہیں، ان کے خطوط شامل ہیں، ان کی تصویریں کتاب کی زینت ہیں، ان کی کتابوں پر ملک کے نامور رسائل اور اخبارات کے تبصرے بھی درج ہیں۔ اب یہ کتاب چھپی تو ملک مقبول احمد نے اپنے ادارے کے سب محسنوں کو پیش کی (واضح رہے کہ انہوں نے اس کتاب کی نمائشی تقریب نمود داری منعقد نہیں کی جس میں

مصنف کے سامنے جھوٹی تعریفیں کی جاتی ہیں) لیکن یہ بھی نہ سمجھئے کہ یہ کتاب ''جنگل میں ناچا مور...... کس نے دیکھا'' کے مصداق بازارِ ادب میں نظرانداز کر دی گئی۔ بلکہ جن ادیبوں کو ہندوپاک میں یہ کتاب ملی سب نے اس کی پذیرائی کھلے بازوؤں کی اور ملک صاحب کو اس کی رسید ایک رسمی خط سے نہیں دی بلکہ اس کتاب پر تبصرہ نما مضمون لکھا تاکہ ان کا لکھا ہوا سند رہے اور رونمائی کی تقاریب میں کی گئی زبانی تقریر کی طرح ان کی باتیں ہوا میں تحلیل نہ ہو جائیں۔ زیرِ نظر کتاب ''پذیرائی'' قریباً ایک صد کے لگ بھگ ادیبوں کے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ میں چند نام فہرست سے حروف تہجی کے اعتبار سے لکھتا ہوں جن کا فرمایا ہوا سند ہے۔ اسرار زیدی، اظہر جاوید، امجد پرویز، امینہ عنبرین، اے حمید، بشیر موجد، بلقیس ریاض، پرتو روہیلہ، جمیل آذر، جوگندر پال، حمید اختر، خواجہ محمد زکریا، سجاد نقوی، چیف جسٹس (ر) ریاض احمد، طارق اسماعیل ساگر، جسٹس (ر) عباس خان، کیول دھیر، مجیب الرحمان شامی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، مناظر عاشق ہرگانوی، عمرانہ مشتاق، علی احمد فاطمی، اور 73 دیگر ادبا جن کے نام جگہ کی قلت کی وجہ سے درج نہیں۔ اس کتاب پر جو تبصرے ہیں، ان میں سے بیشتر ''آپ بیتی نگاری'' کے فن پر بنیادی روشنی ڈالتے ہیں اور ایم اے، ایم فل کے طلبا اگر تحقیق کریں تو ان تبصروں سے آپ بیتی نگاری کی بوطیقا بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ ملک مقبول احمد اس میں ایک تذکرہ نگار اور خاکہ نویس کی صورت میں ابھرے ہیں۔ انہوں نے ہر مصنف کے فن اور زندگی کا اجمالی تذکرہ ان کی تصویر کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ بلاشبہ بعض لوگوں کا نام معروف ہے لیکن ان کے حالات دستیاب نہیں، یہ حالات اب اس کتاب سے دستیاب ہیں اور اب ان کے بارے میں ہم پوری معلومات سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ اہم بات یہ کہ ان مختصر

خاکوں سے جو دراصل تعارف نامے ہیں ملک مقبول احمد ایک خاکہ نگار کی حیثیت میں بھی سامنے آ گئے ہیں۔ ملک مقبول احمد کی ادبی حیثیت ''سفر جاری ہے'' اور ''پذیرائی'' سے قائم ہو چکی ہے۔ میں کتاب ''پذیرائی'' کی کھلے بازوؤں سے پذیرائی کرتا ہوں۔ یہ 2008ء کی پہلی کتاب ہے۔ ماشاءاللہ۔



ادب نامچہ ''نوائے وقت'' لاہور

ڈاکٹر انور سدید

''پذیرائی'' اور ''تعارف نگاری''

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کے باطن میں ایک آپ بیتی موجود ہوتی ہے جس کو اگر الفاظ کا زیور پہنا دیا جائے تو یہ دوسروں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ فرانس کا مشہور دانشور ژان ژاک روسو ایک شہرہ آفاق فلسفی تھا۔ عمر کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر جب اس نے اپنے باطن میں جھانکا تو اس کی ملاقات ایک ایسے انسان سے ہو گئی جو فطرت کا خلقی مظہر تھا۔ اس مرحلہ پر ہی روسو پر انکشاف ہوا کہ یہ انسان تو میں خود ہوں اور پھر وہ اس انسان کو سطح نمود پر لے آیا اور اس کی پوری کہانی لکھ دی جس کا وہ عینی شاہد تھا، کہا جاتا ہے کہ اتنی سچی آپ بیتی، اتنی صداقت اور ایسی بے باکی سے کسی نے نہیں لکھی........ لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر روسو کی ملاقات اپنے باطن کے انسان سے نہ ہوتی تو اس کی خودنوشت سوانح عمری جو دنیا کی ایک مقبول کلاسیکی کتاب ہے، کس طرح معرضِ وجود میں آتی؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کے بھید نرالے ہیں اور اکثر اوقات شخصیات پر ان کا باطن ظاہر ہوتا ہے تو وہ ظاہری وجود اور شخصیت سے مختلف ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خود بھی حیران ہوتا ہے اور اپنے دوستوں کو بھی حیران کر دیتا ہے۔

یہ طویل جملہ معترضہ میں نے اس لئے پیش کیا ہے کہ ہمارے شہر بے مثال لاہور کتابوں کے ایک ممتاز ناشر ملک مقبول احمد نے اپنے پوتے، پوتیوں اور نواسے

نواسیوں کو اپنی زندگی کے واقعات سنانے شروع کیے تو بچوں کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ وہ دادا سے یہ کہانی لکھ ڈالنے کا تقاضا کرنے لگے۔ ان کی یہ سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے چھپ چکی ہے (اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے)۔ اسے ایک اردو ناشر کی پہلی خودنوشت سوانح عمری کہا گیا اور اس کی پذیرائی دنیا میں اتنی زیادہ ہوئی کہ ملک مقبول احمد کو اس کتاب پر لکھے گئے تبصروں پر مشتمل ایک اور کتاب چھاپنی پڑی جس کا عنوان انہوں نے ''پذیرائی'' رکھا۔

مجھے اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ نظر آئی کہ ملک مقبول احمد کے باطن سے ایک باقاعدہ تعارف نگار نمودار ہوا جس نے ہر تبصرہ نگار کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے سابقہ تجربے کی اساس پر اس کا تعارف لکھا تو اس کا ادبی ذائقہ بھی پیدا کیا۔ ملک مقبول احمد کی شخصیت کے باطن میں یہ تعارف نگار موجود تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی ستر، پچھتر سال کی عمر میں یہ کبھی باہر نہیں آیا۔ وہ جب دوستوں کے غیاب میں ان کی باتیں کرتے اور ان میں اپنا ذاتی تاثر اور تبصرہ بھی شامل کر دیتے تو یہ انوکھا ضرور محسوس ہوتا اور ان کے مشاہدے کی گہرائی کی دلالت بھی کرتا تھا۔ اس قسم کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ یہ شخص جو اچانک سوانح نگاری کے میدان میں اترا ہے، وہ مصنفین کی وسیع تر برادری میں محمد طفیل مدیر نقوش کی طرح شامل ہو گیا ہے اور ایک دن ''تعارف نگار'' کے طور پر بھی سامنے آجائے گا۔ ناشرین کی برادری محمد طفیل پہلے خاکہ نگار تھے۔ ان کے خاکوں کی متعدد کتابیں مثلاً ''محترم''، ''جناب'' وغیرہ چھپ چکی ہیں، اس برادری سے اب ایک تعارف نگار کے طور پر ملک مقبول احمد ابھرے ہیں تو اہلِ ادب سے درخواست ہے کہ ان کا تجزیہ کریں اور اگر یہ معیار ادب پر پورے اترتے ہیں تو ان کی تحسین میں بخل سے کام نہ لیں اور یہ بھی غور فرمائیں کہ کیا تعارف

نگاری بھی صنفِ اَدب ہے؟

مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ملک مقبول احمد نے یہ تعارفی مضامین کسی مخصوص اور منضبط فنی زاویے سے نہیں لکھے۔ ان کی مثال ایک انگریزی ڈرامے کے اس کردار کی طرح ہے جس نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا ہے۔ ملک مقبول احمد نے بھی اپنی دانست میں اپنی کتاب کے تبصرہ نگاروں کے تعارف کی رسم ہی ادا کی ہے جس میں ممنونیت اور شکر گزاری کا زاویہ بھی شامل ہے لیکن 80 سے زائد ادیبوں کے سوانحی واقعات کو جمع کرنا، انہیں سلیقے سے ترتیب دینا اور پھر ہر ادیب کی فنی انفرادیت کے مطابق اس پر تحسین آمیز رائے دینا معمولی بات نہیں، اس کے لئے تخلیقی باطن کی ادیبانہ روشنی کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو تعارف نگار کے ذوق کے علاوہ اس کے ظرف کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ''تعارف نگاری'' کو ادب میں ایک الگ صنف کی حیثیت نہیں دی گئی، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ادبائے کرام نے فرداً فرداً تعارف نامے تو قدیم زمانے میں ہی لکھنے شروع کر دیئے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور نہ انہیں کتابی صورت میں پیش کیا گیا تھا کہ اس طرف نقاد توجہ سے دیکھتا اور اس صنف کو موسوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس کرتا۔ اب ملک مقبول احمد کی کتاب ''پذیرائی'' میں 80 سے زائد تعارف نامے شامل ہوئے ہیں تو شاید اہل ادب ''تعارف نگاری'' کو بھی فن کا درجہ دیں اور اس کتاب کو اس نوع کی پہلی کاوش قرار دیں، جو شخصیت نگاری، خاکہ نویسی اور مرقع نگاری کے قرب و جوار کی صنف ادب قرار پا سکتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ نکتہ طراز اور فن شناس ناقدین کرام اس صنف کی ''بوطیقا'' کا تعین کریں۔

واضح رہے کہ رسمی حالات حیات تو تعارف نگاری کی بنیادی ضرورت ہے، تعارف نگاری کی اصل حقیقت اور اس کا ظرف اس وقت سامنے آتا ہے، جب وہ کسی شخص کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ اس ضمن میں ملک مقبول احمد کے تاثرات بڑے معنی خیز ہیں:

☆ ......اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کا اہم سوانحی واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اظہر جاوید کو ان کی جمہوریت پسندی کی سزا دی گئی اور ملازمت سے جبری طور پر فارغ کر دیا گیا لیکن ملک مقبول احمد کے مطابق ''اظہر جاوید بنیادی طور پر رومانوی مزاج کے شاعر ہیں۔'' (صفحہ 50)

☆ ...... ڈاکٹر امجد پرویز کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے تبصروں سے ادیبوں کے اور اپنی نظموں سے عوام کے دلوں کو فتح کرنے والے دانشور ہیں۔ موسیقی ڈاکٹر امجد پرویز کی روح کی غذا ہے۔ رجحان طبع فنون لطیفہ کی طرف تھا لیکن عملی زندگی میں انہوں نے موسیقی کے ساتھ انجینئرنگ کو بھی اہمیت دی۔'' (صفحہ 71)

چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

☆ ......''عبدالستار عاصم کے مضامین کا معیار اتنا بلند تھا کہ انہیں ''علامہ'' تسلیم کر لیا گیا۔ شرقپور شریف گئے تو زندگی کا رخ بھی بدل گیا۔ ان کی سوچ پہلے افقی تھی، اب عمودی ہو گئی۔'' (صفحہ 299)

☆ ......''قائم نقوی کے والد نے ان کے کان میں جو اذان پھونکی وہ تجوید کے تمام تقاضے پورے کرتی تھی، اذان کی اس آواز نے انہیں شاعر بنا دیا اور شاعری میں موسیقی کی لہر دوڑا دی۔'' (ص 349)

☆ ......''نقشبند قمر نقوی کی نظر صرف عجائبات پر جاتی ہے اور اپنی تحریروں سے قارئین

کو متحیر کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ جوان کہلانا پسند کرتے ہیں، اس لئے تاریخ پیدائش نہیں بتاتے، لیکن ملاقات ہو تو جوان بلکہ نوجوان نظر آتے ہیں۔'' (صفحہ 352)

☆...... ''صحافت میں بطور رپورٹر طارق اسماعیل ساگر کو محسوس ہوا کہ یہاں سلسلہ در سلسلہ کہانیاں بکھری پڑی ہیں جنہیں اگر سلیقے سے مربوط کر دیا جائے تو ایک ایسا ناول بن جاتا ہے جو معاشرے کی ترجمانی کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے سبق آموز بھی ہو۔'' (ص 63)

☆......ڈاکٹر طارق عزیز اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے رہتے ہیں ان کو سلام کرنے والے ان کے سامنے جھک جاتے ہیں، دونوں طرف سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا ہے، تو عقیدت اور محبت یوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں جیسے نیلم اور جہلم کا پانی ملتا ہے۔'' (صفحہ 271)

☆......بشیر موجد کو ابتدا ئیں شاعری کا شوق تھا......احسان دانش نے ان کی افتاد طبع کا اندازہ لگا کر مصوری کی طرف راغب کیا اور ان کو ''موجد'' موسوم کر کے مصور ''سرفراز'' کی شاگردی میں دے آئے۔'' (ص 110)

اس قسم کے بیشمار ستارے ملک مقبول احمد کی تالیف ''پذیرائی'' میں چمک رہے ہیں جن پر بے ساختہ داد میرے دل سے نکل کر ہونٹوں پر آ گئی اور میں یہ سوال اردو ادب کے ناقدین کرام کے سامنے رکھنے کی جسارت کرتا ہوں:

''کیا تعارف نگاری کو بھی ادب کی صنف قرار دیا جا سکتا ہے؟''



عبدالستار عاصم

چیئر مین قلم فاؤنڈیشن کمرہ نمبر 14 شالیمار مارکیٹ

مین بلیوارڈ ڈیفنس لاہور

محترم قبلہ ملک مقبول احمد صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ !

سچی بات یہ ہے کہ جب سے میرا آپ سے رابطہ ہوا ہے میں اور میری مسز (کنول عاصم) آپ کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ آپ میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو ایک کامیاب ترین انسان میں ہوتی ہے۔ جو آپ سے ایک دفعہ مل لیتا ہے پھر آپ کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کہ آپ جادو کرتے ہیں یا پھر اپنی محبت کے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ ''پذیرائی'' میں آپ نے میرا مکمل علمی ادبی تعارف شائع کر کے پاکستانی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ میں اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ ''پذیرائی'' حقیقت میں ادیبوں، دانشوروں کی سوانح عمری ہے۔ پھر آپ نے کمال شفقت فرمائی کہ اہل قلم کے خطوط میں میرے اور میری مسز (کنول عاصم) کے خط شائع کیے۔ آپ کی کتاب ''شناسائی'' منظر عام پر آنے والی ہے۔ ہم اس کی اشاعت پر ایڈوانس مبارک باد دیتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آپ جیسی شخصیات یقیناً بہت کم رہ گئی ہیں جو ہمیشہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا سوچتے اور کرتے ہیں۔ میں آپ کو یہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں'' کہ یہ واقعہ ممتاز بیورکریٹ اور دانشور قدرت اللہ شہاب نے اپنی ایک کتاب ''شہاب نامہ'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں منگلا ڈیم گیا وہاں میر پور (آزاد کشمیر) کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس کا زیادہ تر حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا ایک روز میں

مقامی افسر کو اپنی جیپ میں بٹھا کر ملبے کے گرد گھوم رہا تھا کہ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی گدھے کو ہانکتے ہوئے لے کر جا رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ اسی طرح اُنکے جوتے بھی تھے اُنہوں نے اشاروں سے ہماری جیپ کو روک کر دریافت کیا کہ بیت المال کہاں ہے۔ آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا تھا میں نے پوچھا (سرکاری خزانہ) بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے۔ بوڑھے نے بڑی سادگی اور انکساری سے جواب دیا میں نے اور میری بیوی نے مل کر میر پور شہر کے ملبے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دو بوریاں جمع کی ہیں اب انہیں اس گدھے پر لاد کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور دو بوریوں کو اپنے ساتھ جیپ میں لاد کر ساتھ بٹھا لیا تا کہ انہیں بیت المال تک لے چلیں۔ آج بھی جب وہ کمزور اور مفلوک الحال بوڑھا جوڑا یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تو ان کے گرد آلود پاؤں اور گرد آلود جوتے اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھنا چاہیے تھا ایسے پاکیزہ سیرت لوگ کہاں ملتے ہیں؟''

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر......

میں سمجھتا ہوں جس طرح ان بوڑھے جوڑے نے میر پور شہر کا ملبہ کرید کرید کر سونے چاندی کی دو بوریاں بیت المال میں جمع کروانے کے لئے قدرت اللہ شہاب سے رستہ پوچھ رہے تھے اور انہوں نے اپنی نگرانی میں سونے اور چاندی کی بوریاں بیت المال (سرکاری خزانے) میں جمع کروا دی اسی طرح آپ نے بھی ساری زندگی علم و ادب کا خزانہ کرید کرید کر تلاش کیا اور پھر اپنی اکیڈمی کے ذریعہ اسی خزانے کو کتابوں کی شکل میں

شائع کر کے پاکستان سمیت دنیا بھر کے علمی خزانے (لائبریریوں) میں جمع کروا دیا اور کروا رہے ہیں۔ یہ آپ کی لامتناہی علمی، ادبی خدمات اور شوق ہے۔ اسی شوق اور محنت سے آپ نے وہ کمال کر دیا ہے جو اِن بوڑھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیا لیکن آپ نے یہی خزانہ اپنی زندگی کے آغاز سے لیکر اب تک لوگوں کے دل و دماغ میں جمع کیا اور کر رہے ہیں۔ آپ جیسی قابل احترام شخصیت کو وہی احترام و عزت دینی چاہیے جو قدرت اللہ شہاب کی خواہش ان بوڑھے جوڑے کے متعلق تھی۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

والسلام

عبدالستار عاصم

محمد بدر منیر

ایڈیٹر ہفت روزہ مزدور

میکلوڈ روڈ، لاہور

''پذیرائی'' کی پذیرائی

ملک مقبول احمد کے بارے میں اب انکشاف ہوا کہ وہ ''لیٹ'' نکالنے کے ماہر ہیں کہ انہوں نے ایک سال میں دو کتابیں لکھ ڈالیں اور اب تیسری کتاب بھی انشاء اللہ جلد منظر اشاعت پر آجائے گی، اور اس کے بعد بھی نہ جانے کتنی کتابیں ان کے نہاں خانہ دل میں مچلنے کے لیے بے تاب ہیں، خدا کرے زور قلم اور زیادہ......!

پہلی کتاب ''سفر جاری ہے'' کی صدائے بازگشت ادبی اور اشاعتی حلقوں میں ابھی گونج ہی رہی تھی کہ اب ''پذیرائی'' نگاہوں کے سامنے ہے۔ حسن طباعت تو مقبول اکیڈمی کا طرہ امتیاز ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ حسنِ تحریر کے بعد حسنِ انتخاب میں بھی ملک صاحب اپنے ہم منصب حضرات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' سے ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا حلقہ احباب دنیا کے پانچوں براعظموں میں پھیلا ہوا ہے اور ان کے دوست جہاں ہیں۔ ملک مقبول کی یاد ان کے دلوں میں اور وہ ملک مقبول کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔ ''پذیرائی'' کے مطالعہ سے یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ایک گمنام شخص ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا اپنی جدوجہد اور خلوصِ نیت کے باعث وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سرمایہ دار بننا تو کوئی مشکل نہیں لیکن وقار اور عزت کا حصول اور اسے برقرار رکھنا دنیا میں مشکل ترین منزل ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک ایسے خاندان کی بھی داغ بیل ڈالی اور اسے اس طرح پروان چڑھایا کہ ''ایں ہمہ خاندان آفتاب است'' کے محاورے کا سوفی صد مستحق قرار پایا۔ اولاد ماشاء اللہ سب کی سب سعادت منداور معاشرے کے لیے قابل فخر۔ بڑے بڑے ارب پتیوں کو بھی اپنے تمام مال ومنال کے باوجود نہ ایسا مخلص حلقہ احباب میسر ہے اور نہ ایسا سعادت مند خاندان بلکہ ہر لحاظ سے تہی دست کہ نہ ان کا مال ان سے وفادار ثابت ہوا اور نہ ان کے خاندان نے ہی ان سے وفا کی۔ یہاں تک کہ ان خواتین وحضرات نے جو ادارے قائم کیے وہ بھی اقتدارِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

''پذیرائی'' میں بھی اپنے ہمدم دیرینہ کی باتصویر تحریر بھی نظر سے گزری۔ عرصہ دراز کے بعد ان کی تحریر اور تصویر دیکھ کر جی خوش ہو گیا کہ کسی ہمدم دیرینہ کی یادیں بھی دفتر کی ملاقاتوں سے بہتر ہیں، لیکن سید قاسم محمود کے بارے میں ایک تفصیلی تحریر مجھ پر قرض ہے۔ انشاء اللہ یہ قرض بھی جلد ادا ہو جائے گا کہ عمر کے اس حصے میں ہر قسم کے قرض کی ادائیگی واجب ہے۔ ''پذیرائی'' میں ہی سعید بدر سے بھی ملاقات ہوگئی۔ روبرو ملاقاتیں تو اب قصہ پارینہ بن گئیں کہ یاروں نے ایک شہر میں رہنے کے باوجود اپنے ٹھکانے اتنے دور دور بنا لئے ہیں کہ وہاں تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل مرحلہ بن چکا ہے، اور شہر میں ریستورانوں اور کافی ہاؤس کی روایت بالکل ختم ہوگئی ہے کہ یہی کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس احباب کے مل بیٹھنے کی پناہ گاہ تھی......!



روزنامہ خبریں

پذیرائی

کسی کی حوصلہ افزائی یا پذیرائی کرنا انسان کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں کچھ ایسا ماحول بن گیا ہے کہ ہم ہر چیز کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہی بات ہمیں آگے کی طرف قدم نہیں اٹھانے دیتی۔ تاہم اس کے باوجود آج بھی ہمارے درمیان کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو دوسروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر نہ صرف خوش ہوتی ہیں بلکہ علم و ادب کا شوق رکھنے والوں کو منزل پر پہنچنے کے لیے زینہ بھی فراہم کرتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''پذیرائی'' بھی ایک ایسا ہی زینہ ہے جو ہمیں ان صاحب فن و کمال سے متعارف کرواتا ہے جنہوں نے شعر و ادب اور صحافت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ملک مقبول احمد دنیائے ادب کے وہ جوہری ہیں جن کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ کتاب میں دنیائے ادب کی جن شخصیات کا ادبی تعارف شامل کیا گیا ہے یوں تو ان میں بہت سے نام ہیں تاہم چند نام معتبر حوالے کے طور پر لیے جاسکتے ہیں جن میں ابوالامتیاز ع، س مسلم، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وحید قریشی، امجد اسلام امجد، مجیب الرحمٰن شامی، طالب ہاشمی، علی سفیان آفاقی، وزیر آغا، قائم نقوی اور علامہ عبدالستار عاصم شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس کتاب کو قلمکاروں کا منی انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔



حصہ سوم

راہ نوردِ شوق

فہرست

اعتبار ساجد

استاد شعبہ اردو فیڈرل گورنمنٹ کالج فار مین

H-9 اسلام آباد

راہ نوردِ شوق

بعض کتابیں خود بولتی ہیں۔ لیکن بعض کتابوں کے مصنف خود اتنا بولتے ہیں کہ کتابیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر روز'' ہر ہفتے'' ہر مہینے رسالوں، اخباروں کی طرح دھڑا دھڑ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ زیادہ تر ان کے مصنف ہی بولتے سنائی دیتے ہیں۔ ایک بولنے والی کتاب کئی دن سے میرے بک شیلف میں گنگنا رہی تھی۔ اسے پہلی فرصت میں پڑھ اور سن لیا تھا۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ جواباً میں بھی کچھ بولوں۔ میں کیا بولوں، جس کتاب کا نام ہی'' راہ نوردِ شوق'' ہو اور جس کا مصنف ملک کا مانا ہوا ادیب دانشور اور انشائیہ پرداز ہو اس کی منہ بولتی کتاب کے آگے لب کشائی یا خامہ فرسائی کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ جبکہ یہ کتاب ہمارے عہد کے نامور پبلشر'' ادیب اور ایک زمیندار انسان ملک مقبول احمد کی زندگی کا احاطہ کرتی ہو۔ سب سے خوبصورت پہلو جو اس کتاب کے باب اول سے باب آخر تک اُجلا اور درخشاں رہتا ہے۔ وہ مصنف کا مخصوص ذاتی انشائی طرز نگارش ہے۔ دلآویز، سادہ مگر پرتاثیر کمال یہ ہے کہ مصنف اور پبلشر اس کتاب میں یک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔'' ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی صاحب طرز مصنف کسی شخصیت پر کچھ لکھتا ہے تو وہ اپنی شخصیت کو بالادست رکھتا ہے۔ یہاں زبردست اور بالاقسم کا کوئی معاملہ نہیں۔ ایک بے

ساختہ اظہار کی ندی ہے جو سبک روی سے بہتی چلی جاتی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر انگریزی ادب کے استاد بلند پایہ نقاد اور اعلیٰ درجے کے انشائیہ نگار ہیں۔ 30 جون 1930ء کو بھارت کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے انگلش اور ایم۔اے اردو کی ڈگریاں پنجاب سے حاصل کیں۔آپ کا نام ڈاکٹر وزیر آغا پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، مشتاق قمر اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش جیسے انشائیہ کے بنیاد گزاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انشائیوں کی تین کتابوں" شاخ زیتون"" رت کے مہمان" اور" وقت اے وقت" شائع ہو کر ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ تراجم اور تنقید میں بھی آپ نے خاصا نام کمایا ہے۔

" راہ نوردِ شوق" یعنی ملک مقبول احمد کے حوالے سے پروفیسر جمیل آذر کے یہ الفاظ یادر کھے جانے کے قابل ہیں۔

ہر کام کے لیے علم چاہیے۔ اور یہ علم ہے اخلاق کا، ایمان کا، لین دین کا، اور حقوق العباد کا۔ اسلام کے دین کی بنیاد ہی اللہ کے سامنے جوابدہی کے یقین کا ہے۔ کرامُ الکاتبین ہمارے اعمال لکھتے رہتے ہیں اور ہماری جزاو سزا انہی اعمال کی بنیاد پر ہوگی ۔

" لیکن جب ہم خوف خدا کو دل سے نکال دیتے ہیں تو پھر نفس امارہ کی گرفت میں آجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ حسد، بغض، اور نفرت کی آگ میں جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ایک لحہ بھی یادالٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔"

یہ ہے وہ خوبصورت اقتباس جو ایک طرف ملک مقبول احمد کے معتقدات کی آئینہ گری کرتا ہے اور دوسری طرف صاف باطن مصنف کے نظریہ حیات کو اجاگر کرتا ہے۔

" نائن بی سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تھا" ذرا شیطان کی وضاحت کیجئے۔"

اس نے کہا تھا شیطان کے بارے میں خود اللّٰہ تعالیٰ نے صراحت سے اپنی کتابوں میں فرما دیا ہے۔ البتہ اتنا میں جانتا ہوں کہ شیطان خواہ کتنا ہی شوریدہ سر کیوں نہ ہو فتح بہر حال انسان اور انسانیت کی ہے۔''

مدر ٹریسا اپاہجوں اور کوڑھیوں کے ایک ہاسپٹل میں گئیں ۔ مریضوں کی تیمارداری کی واپسی پر آسمان کی طرف دیکھ کر اس بوڑھی نن نے کہا، انسانیت بہت دکھی ہے لیکن پروردگار بہت غفور و رحیم ہے۔ وہ سانپ کی کینچلی بدل دیتا ہے تو کوڑھیوں کو شفا کیوں نہیں دے سکتا؟''۔

پروفیسر جمیل آذر کی کتاب میں جا بجا ایسی تمثیلیں ، ایسے واقعات اور ایسی جزئیات ملتی ہیں کہ ملک مقبول احمد کی شخصیت ہمیں اور روشن اور تابندہ نظر آتی ہے۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مصنف کا اپنا باطن شفاف ہو۔

ہمارے ایک دوست نے پیسہ کمانے کے لیے کلاتھ مارکیٹ کے ایک مقبول اور متمول تاجر پر کتاب لکھنے کا قصد، عنوان رکھا ''سوانح حیات الحاج قبلہ بدرالدین صدر انجمن کلاتھ مارکیٹ'' پھر پہنچے الحاج صاحب کے پاس۔ انہوں نے سر کھجا کر پوچھا۔ ''سوانح حیات کا کیا مطلب ہے''؟ مصنف نے انہیں مطلب سمجھایا۔ تاجر صاحب نے پھر کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا۔ آخر جھٹ سے دس روپے نکال کر مصنف کے ہاتھ پر رکھے اور فرمایا ''فی الحال تو یہ لے جاؤ اور اپنا کام چلاؤ۔ جہاں تک سوانح والا کام ہے وہ ہم تم سے کیوں کروائیں۔ اپنے منشی سے کیوں نہ کروائیں جو ہمیں برسوں سے جانتا بھی ہے' خوشخط بھی ہے اور ہمارا ملازم بھی۔''

شخصی خاکہ نگاری کا معاملہ ہو یا کتاب سازی کا۔ یہ واقعی بڑا نازک اور سوجھ بوجھ کا کام ہے۔ جو کوئی اس کام میں ہاتھ ڈال دے تو نہ شخصیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ نہ

مصنف کا وقار قائم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شخصیت بھی پائے کی شخصیت ہے اور مصنف بھی منجھا ہوا ادیب ہے۔ اس نے محض ایک شخصیت کی داستان حیات رقم نہیں کی بلکہ کئی ادوار کی تہذیبی، سماجی، سیاسی، ادبی اور روحانی قدروں کی عکاسی کی ہے اور ایسے خوبصورت پیرائے میں کی ہے کہ ہمارے عہد کے نامور ادیب اور دانشور ڈاکٹر انور سدید کو بے ساختہ لکھنا پڑا۔

''راہ نوردِ شوق'' میرے انشائی تنقید کے تصور concept کی عملی تصویر ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح میں نے اس معزز شخصیت کو دریافت (discover) کیا اور انہیں احترام و محبت سے دیکھا آپ بھی انہیں ایسا ہی پائیں گے اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ملک مقبول احمد ان نفوس قدسیہ میں سے ہیں جو ہمیں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا چراغ بن کر صراط مستقیم کا راستہ دکھاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جس صفائی سچائی، اور خلوص دل سے ملک مقبول احمد اور کتاب کے مصنف کو خراج تحسین پیش کیا ہے اس کے بعد میرے بولنے کی گنجائش ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ کتاب خود بول رہی ہے البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جن لوگوں کو خوبصورت انسانوں اور خوبصورت تحریروں سے پیار ہو وہ ایک مرتبہ اس کتاب کو ضرور پڑھ لیں۔ کتاب بولے گی تو ان کی سماعتیں دنگ رہ جائیں گی۔

رموز عقل کے سربستہ راز کھولے گی
زباں خموش رہے گی کتاب بولے گی



Dr. Amjad Parvez

Rah Naward-e-Shauq

Dedicated to writers the book titled *Rah Naward.e.Shauq* by prof Jameel Aazar starts with the quote From George Benard Shaw that ,the men who about himself ,and his own time is the only man who writes about all people and all time : the book under review is a biography of Malik maqbool ahmad. the publisher com writer, as well as professor jameel Aazar,s autobiography,it is very difficult to draw a line where one ends and the other starts. Often he gets inspired from certain issues dealt with in the former to quote his own experiences. It was Dr. Anwar Sadeed who had convinced Professor Saheb to write this book after getting impressed with the qualities of Malik Maqbool Ahmad in his autobiography "*Safar Jari Hei*" and appreciation "*Pazeerai*". Professor Jameel Aazar is basically among the pioneers of Inshaiya (short essays) writers. He advocates the concept of criticism in Inshaiya writing. His first article on the outlook of such critisims was printed in the magazine "*Symbol*" in 2007 followed by another article titled "*Inshaiye Tanqeed, Jheel Aur Narcissus*" in Alhamara's January 2008 issue. He is also a teacher of English and a critic par excellence. The quintessence of such criticism is that it involves the critic fully with the creative does not simply study the book and carry out the appraisal but also

shows full attachment, love and involvement with the text. Professor Saheb advocates that such in-depth study provides intellectual bliss and spiritual satisfaction to the critic. The next step is to share these aesthetic moments with the readers. In essence the inshaye criticism is to create new and create afresh. Though the process is difficult, it is achievable. Its essence is based on contemplation. All the bases of critical appreciation, instead of being based on external factors emanate from within. An example of this perception is the book under review.

Few examples of where the author got inspired from certain statements made by Malik Maqbool Ahmad on different issues are in chapter titled "*Husn Parast Shakhsiat*" the author refers to the romantic personality of Sheikh Saheb. Professor Jameel Aazar provides his own theory on this issue that there are three phases of love, one if a child is not taking interest in sports then there is something wrong, two if he does not fall in love when young then again something is wrong and three, if he does not fall in love with God when old then again something is wrong, b) in chapter titled "*Dasht-e-Ishq Ka Raahnaward*" the notion of life is discussed especially with regards to the love for one's mother. Such energy motivates one to carry out something extraordinary in one's life. That is why Iqbal had once said "*Ishq Key Mizraab Sey Naghma-e-Taar-e-Hayat/ Ishq Sey Noor-e-Hayat, Ishq Sey Naar-e-Hayat* Comparing the rural life as kept backdrop by writers of stature such as Prem Chand, Balwant Singh, Rajinder Singh Bedi, Ahmad Nadeem Qasim and Ghulam us

Saqlain Naqvi, the author states that Maqbool is not left far behind. Inspired, Professor Jameel Aazar writes at length on rural life. Use of wells for drinking water, emphasis on breakfast, birds flying in the rainy season, agriculture, fairs and festivals have been highlighted at length in the chapter titled "Dehi Saqafat Nigaar". Recitation of Mian Muhammad Bukhsh's Saif ul Maluk sitting in the shades of an old tree has been specially referred to.

Wordsworth had once said in the prelude to the book 1, that fair seed time had his soul and he grew up fostered alike by beauty and by fear. Jameel Aazar is nostalgic about his childhood and makes this reminiscence universal. While remembering Malik Maqbool's childhood friends, he recalls his friends as well. Dear readers shall agree with this reviewer that friends one makes while in power vanish the moment one is no longer in the chair of power. Only those friends that one makes when young. Even if the age limit is ignored one can count one's friends on fingertips.

Proffessor Jameel is impressed with the concept of informal education. He says that this approach can only be adopted by a person whose mind is creative, philosophical and who is a thinker, though the value of formal education cannot be ignored. It is true as many in our society get informal education from persons of experience while in conversation with them or by just listening to their ideas as exchanged with the participants. The subsequent chapters are dedicated to the issues of prize schemes and Malik Saheb's wedlock. The problems of establishing a publishing house

wherein Malik Saheb had to sell even the jewelry of his wife has been referred to. Two chapters have been reserved for Malik Saheb's adventure in agriculture, Lessons were learnt when one of his confidant ran away with his tractor but this incidence made Malik Saheb to set up Maqbool Academy.

The first successful venture was the publishing of Raees Ahmad Jafri's books titled 'Quiad-e-Azam ur Unka Ehed, 'Khutbaat-e-Quid,'Shahab-ud-din Ghauri', 'Khalifa Haroon Rasheed Aur Unka Ehed' etc. followed by Maulana Abul Kalam Azad's autobiography "India wins freedom". Malik Saheb remembers a friend Malik Allah Daad who lent him five thousand rupees in late fifties to keep his business running. Details of further growth of publishing business have been given in the chapter titled "*Ishaati Kaam Main Wus'at-o-Irteqa*" and his access to the libraries. Incidences in Malik Maqbool's life as highlighted in the chapter titled "*Haadisaat-e-Zindagi Aur Sanad-e-Imtiaz*" motivated Professor Jameel to come out with certain incidences in his life was well. So as Churchill once said becomes true once again that we make a living by what we get and we make life by what we give.

Though Professor Jameel Aazar claims to have spiritual life long relationship with Malik Maqbool, his friendship lasted for a year as of May 16, 2008 when he wrote the concluding of the book under review. All what he learnt was similarities of views and values that he desired to impart to the younger audience. He still wonders whether the book under review was Malik Saheb's biography his own autobiography! It is this fact that makes this book unique.

Daily Nation Lahoe



ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور
ڈاکٹر انور سدید
دسمبر 2008ء

راہ نوردِ شوق

پروفیسر جمیل آذر انگریزی زبان وادب کے ایک ایسے معلم کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے طالب علم ان کی غیر حاضری میں تعریف وتحسین کرتے ہیں اور ان کے معاصر اساتذہ انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد یاد کرتے ہیں۔ 1966ء میں ''اوراق'' جاری ہوا تو راولپنڈی کے جن مزاح نگاروں نے طنز ومزاح سے انشائیہ نگاری کی طرف پیش قدمی کی ان میں مشتاق قمر کے ساتھ جمیل آذر بھی شامل تھے۔ مشتاق قمر اب وفات پا چکے ہیں لیکن جمیل آذر نے انشائیہ تخلیق کرتے کرتے اس صنف کے تخلیقی عناصر اپنی شخصیت میں بھی جذب کر لیے اور وہ ''انشائی تنقید'' کے علمبردار ہیں۔ وہ اس تصور کے بانی بھی ہیں اور اب اس کی پرزور وکالت بھی کر رہے ہیں۔ آپ انہیں فی الحال اس تصور کا منتہی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے لاہور میں کتابوں کے ایک ممتاز ناشر ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' پڑھی تو انہیں محسوس ہوا کہ ''ملک مقبول احمد ان نفوس قدسیہ میں سے ہیں جو ہمیں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا چراغ بن کر صراطِ مستقیم کا راستہ دکھاتے ہیں۔'' ملک صاحب کا بچپن۔ لڑکپن اور جوانی کا اوائلی دور ایک دیہات میں گزرا تھا۔ جمیل آذر صاحب کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی دیہاتی زندگی کے تمام واقعات خود ان کی زندگی میں بھی وارد ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے انشائی رویے کے مطابق اس کتاب پر طویل تبصرہ لکھا تو اس کتاب کو اپنی زندگی سے عبارت قرار دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس پرخلوص بات سے اتنا متاثر ہوا

کہ انہیں یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا:

''آپ تو اس پر کتاب لکھ سکتے ہیں بلکہ میں اصرار کروں گا کہ ضرور کتاب لکھیں۔ یہ اپنی نوعیت کا نیا کام ہے جو آپ کو کر ڈالنا چاہیے۔''

مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ جمیل آذر صاحب میری گزارش کو اس قدر پذیرائی عطا کریں گے کہ واقعی کتاب لکھنے بیٹھ جائیں گے۔ ٹیلی فون پر مجھے کہنے لگے ''میں ملک مقبول احمد کو ان کی کتاب سے دریافت کر رہا ہوں۔ ان کی کتاب مجھ سے میرا بچپن بازیافت کرا رہی ہے۔ مجھے اپنا گاؤں دوبارہ زندہ محسوس ہو رہا ہے جو پہلے میرے دل میں دفن ہو گیا تھا۔'' انہوں نے چند ماہ میں کتاب مکمل کر لی اور اس کا مسودہ مجھے پیش لفظ لکھنے کے لیے ارسال فرمایا تو مجھے بے پایاں خوشی ہوئی، انہوں نے ایک ایسا کام انجام دیا تھا جو پہلے دنیا کے کسی خطے میں، کسی ادیب نے، اپنی زبان کے ادب میں نہیں کیا۔ اب یہ کتاب ملک مقبول احمد کی سوانح حیات ہے تو پروفیسر جمیل آذر کی آپ بیتی بھی ہے۔ اب اس میں دو شخصیات اور دو زمانے سما گئے ہیں، اور ایک یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ پاکستان کے سب دیہات میں زندگی کی رفتار اور اس کا تہذیبی چلن قریباً ایک جیسا ہے۔ کتاب کا ہر باب ''سفر جاری ہے'' کے کسی باب سے شروع ہوتا ہے۔ جمیل آذر ایک ماہر قلم کار کی حیثیت میں چاک کو گھماتے گھماتے اس سے اپنی زندگی کا ظرف تشکیل دینے لگتے ہیں اور قاری کو اس انبساط میں شامل کر لیتے ہیں جسے جمیل آذر جاگتی آنکھوں کے خواب کی طرح دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اس کتاب کے بارے میں کہنے کی سب باتیں اپنے ''پیش لفظ'' میں لکھ دی ہیں جو اس کتاب میں شامل ہے۔ آپ اس تعارف کو ایک خبر کی حیثیت دیں کہ دنیا کی ایک انوکھی کتاب مطلعِ ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح طلوع ہو گئی ہے۔ جس کا خیر مقدم میں کھلے بازوؤں سے کرتا ہوں اور

جمیل آذر صاحب کو اس تجدد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بلاشبہ اس کتاب نے اُردو زبان کی ثروت میں اضافہ کر دیا ہے۔ آپ متذکرہ بالا پتے سے منگوا کر پڑھیں گے تو میرے بیان کی توثیق کریں گے اور جمیل آذر صاحب کو اس پتہ پر خط لکھ کر انہیں میری طرح مبارکباد پیش کریں۔ پروفیسر جمیل آذر۔ ۸۷۴بی۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی۔

ڈاکٹر انور سدید



شفیع ہمدم
گلی نمبر 1 مکان نمبر 17 مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

تُو راہ نوردِ شوق ہے۔۔۔

پروفیسر جمیل آذر کو کتاب ''راہ نوردِ شوق'' لکھنے کا خیال ملک کے معروف ناشر ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' کو پڑھنے کے بعد آیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان کے رخشِ خیال کو مہمیز کیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے انہیں ''سفر جاری ہے'' کا ایک نسخہ بھجوایا اور اس پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی۔ کتاب کے حسن نے ابتدا ہی میں انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے توں توں ان پر کتاب کا حسن واشگاف ہوتا گیا۔ کتاب کا رواں اور سلیس اسلوب اور دلچسپ واقعات سے بے حد متاثر ہوئے اور اس پر ایک مضمون تحریر کیا جسے ڈاکٹر صاحب نے بہت پسند کیا اور ''پذیرائی'' میں شامل کر لیا گیا۔ جس میں چھیاسی ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔

ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' نے جمیل آذر کو اس لیے بھی متاثر کیا کہ اس کا اسلوب انشائی ہے۔ ان کا شمار اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انشائی تنقید کے تعارف نگار اور علم بردار بھی ہیں۔ انشائی تنقید پر ان کے دو مضامین اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ پہلا مضمون ''انشائی تنقیدی رویہ'' ''سمبل'' راولپنڈی میں اور دوسرا ''انشائی تنقید، جھیل اور نارسی سس'' کے عنوان سے ''الحمراء'' لاہور میں۔ ان دونوں مضامین میں انہوں نے انشائی تنقید کی مبادیات اور شعریات پر

سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ جنہیں اہل ذوق نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

پروفیسر جمیل آذر کو اس آپ بیتی نے اس لیے بھی متاثر کیا کہ ملک مقبول احمد کی زندگی کا ابتدائی دور دیہاتی ماحول میں بسر ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیہی ثقافت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جمیل آذر کی زندگی کے ابتدائی دور پر بھی دیہی ثقافت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ملک صاحب کی آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں پہنچ گئے ہوں۔ چنانچہ ''راہ نورِ دِشوق'' میں ایک نہیں دو شخصیات کی آپ بیتیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بالائی سطح پر ملک مقبول احمد کی اور زیریں سطح پر جمیل آذر کی۔ ان دونوں میں ایک قدر یہ بھی مشترک ہے کہ دونوں سیلف میڈ ہیں۔

ملک مقبول احمد کا تعلق سیالکوٹ کے ایک دیہات دیووال سے تھا۔ جہاں انہوں نے بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ گزارا تھا۔ ان دنوں دیہاتوں میں ان کی ثقافت پورے عروج پر تھی۔ پرانی روایات نے دیہاتوں کو اپنے اندر پوری طرح ضم کر رکھا تھا۔ دیہاتی فضا چرخوں کی آوازیں، رنگین مدھانیوں کا مدھر شور، پازیبوں کی جھنکاروں، گیتوں، ماہیوں کی آوازوں سے گونجتی رہتی تھی۔ ملک مقبول احمد دیہات کے ان مناظر کو خوبصورت لفظوں کا جامہ پہنا کر یوں پیش کرتے ہیں۔

> ''موسم گرما میں صبح کے کام کاج سے فارغ ہو کر محلے کی کچھ عورتیں حویلی میں جمع ہو کر چرخہ کاتتیں، کپاس بیلتیں، سرکنڈے اور کھجور کے رنگ برنگے پتوں سے مونڈھے، ٹوکریاں، چنگیریں، چھابے اور جانے کیا کیا بناتیں۔''

ملک صاحب آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ ان عورتوں میں سریلا گلا رکھنے والی خواتین معراج نامہ، ہیر وارث شاہ اور یوسف زلیخا پڑھتیں۔ کبھی کبھی دوہوں کا مقابلہ بھی

کرتیں۔ خوش الحان خواتین کی آوازیں ماحول کو سحر زدہ کر دیتی تھیں۔ جمیل آذر کا بچپن بھی دیہات میں گزرا تھا۔ چنانچہ وہ اس دیہاتی ماحول اور ثقافت آشنا بھی تھے اور متاثر بھی ''سفر جاری ہے'' کے مطالعہ کے دوران ان کا رہوار تخیل ماضی کی شاہراہ پر تیزی سے دوڑنے لگتا ہے اور وہ جلد ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں بچپن اور لڑکپن کی یادوں کے پنچھی ماضی کے آسمان پر محو پرواز ہوتے ہیں۔

جمیل آذر رقم طراز ہیں کہ بچپن میں کھیل کود میں حصہ نہ لینے والا بچہ بیمار، جوانی میں حسن و عشق کی وادی میں قدم نہ رکھنے والا نوجوان نفسیاتی اصول کے آئینے میں ملک مقبول احمد کی شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انہیں تینوں ادوار میں صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنی آپ بیتی میں نہایت سادگی، سچائی اور معصومیت سے کہتے ہیں ''میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا تھا۔ خوبصورت اور دلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی تھی۔

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ملک صاحب کا خوبصورت شمی پر فریفتہ ہونا، بعد ازاں دو سگی بہنوں شہناز اور شمشاد کی محبت میں گرفتار ہو جانا۔ شہناز کا بچپن میں انتقال کرنا اور شمشاد کا (اپنی مرضی کے خلاف) بیاہ کر دوسرے گاؤں چلے جانے کے بعد ان کی دونوں افلاطونی محبتیں اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ ان کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرؔ کی طرح دور سے حسن کا نظارہ کرنے والے شخص تھے۔ غالبؔ کی طرح دامن کو حریصانہ کھینچنے کی جرأت رندانہ کی ان میں کمی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ ان کے بچپن کے زمانے میں خواتین دوسروں کے سامنے اپنے شوہروں سے بھی پردہ اور حجاب کیا کرتی تھیں۔ گاؤں کے بچوں کے مشاغل شہری بچوں کے اشغال سے بالکل مختلف تھے۔ جوہڑوں اور نہروں میں نہانا، غوطے لگانا، بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنا، پیڑوں کے تنوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرنا، کچے پکے پھل توڑنا، کھیتوں سے گاجریں، مولیاں، تربوز اور خربوزے توڑ کر کھانا، آنکھ مچولی کھیلنا، کشتی، کبڈی اور دیگر کھیلوں میں حصہ لینا ان کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ دیہاتوں میں میلے ٹھیلوں کا انعقاد، ریچھ اور بندر کے تماشے، مداری کا طوطے سے توپ چلوانا، آخر میں دست سوال دراز کرنا اور دیہاتیوں کا خوش ہو کر پیسے دینا، ناٹکوں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال جیسے معروف زمانہ قصوں کا سوانگ بھرنا، نوعمر لڑکوں کا زنانہ لباس پہن کر، ہیروئن کا کردار ادا کرنا، نسوانی آوازوں میں گانے گا کر لوگوں کے لیے تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا اور شائقین کا دل کھول کر ان پر روپے نچھاور کرنا اس دور میں بہت عام تھا۔

پروفیسر جمیل آذر کو ملک مقبول احمد کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے ملک صاحب نے ان کی آپ بیتی تحریر کی ہے۔ اس لیے تو انہوں نے ''سفر جاری ہے'' پر دو سو انسٹھ صفحات پر مشتمل کتاب ''راہ نوردِ شوق'' تحریر کی ہے۔ میرے خیال میں اس سے قبل کسی پبلشر نے اپنی آپ بیتی تحریر نہیں کی اور نہ ہی کسی نقاد نے کسی ایک سوانح عمری پر کوئی ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی میں وہی کچھ لکھا ہے جو ان کی زندگی میں پیش آتا رہا ہے۔ انہوں نے نہ تو کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ ان کی آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کی ظاہری شخصیت سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور ان کے باطنی جزیروں کی

سیاحت کے مواقع بھی کثرت سے ملتے ہیں۔جن سے ہم حظ بھی اٹھاتے ہیں اور ان کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔اس ضمن میں پروفیسر جمیل آذر لکھتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی ظاہری اور باطنی تصویر ہے۔جس میں ان کی معصومیت کا حسن اپنا نور بکھیر رہا ہے۔اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر کا بچہ بدستور زندہ و تابندہ ہے بچپن میں وہ اپنے گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اب بڑھاپے میں اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔اپنی جیون کتھا میں وہ قاری کو بھی شاید یہی کہہ رہا ہے کہ ''بچپن کے دن بھلا نہ دینا''۔

ملک مقبول احمد کو اپنے بچپن کے دوستوں میں میر خلیل احمد اور گیان چند (جوانی کے کلاس فیلو بھی تھے) بہت یاد آتے ہیں۔گیان چند اور وہ دونوں سکول سے اکٹھے بھاگا کرتے تھے اور بیری کے تنوں پر بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے۔ملک صاحب کو بچپن میں بٹیر پالنے کا بھی شوق تھا۔ملک صاحب کے دوستوں کے بارے میں پڑھتے ہوئے جمیل آذر کے ذہن میں ان کے بچپن کے دوست گردش کرنے لگتے ہیں جو میر خلیل اور گیان چند سے چندے مختلف نہ تھے۔

ملک مقبول احمد نے دیہی کرداروں میں ماسٹر فیروز دین، چوہدری مولا داد، میاں اللہ ماہی اور چوہدری دسوندھی خان کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ماسٹر فیروز دین کا شمار ایسے اساتذہ میں ہوتا تھا جو تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی کردار سازی اور شخصیت سازی پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ملک صاحب کے دماغ پر جب امارت کے غرور کا نشہ چڑھنے لگا تو ایک روز ماسٹر فیروز دین نے ان سے کہا ''بیٹا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے'' نرم لہجے میں کی گئی دانائی کی اس بات سے وہ بہت شرمندہ ہوئے اور ان کے

غرور میں واضح کمی آ گئی۔

دیہی کرداروں میں ایک خوبصورت کردار میاں اللہ ماہی کا ہے۔ (کرداروں کے نام اپنے اندر وہی ثقافت کے اثرات لیے ہوئے ہوتے ہیں) اللہ ماہی ایک دکاندار تھا جس کی دکان سکول کے راستے میں تھی۔ وہ اپنی دکان بچوں کی چھٹی ہونے سے پانچ منٹ پہلے بند کر دیتا تھا۔ سکول بند کرنے کی وجہ میاں اللہ ماہی کی زبانی سنیے

''میاں صاحبزادے! تم ابھی اپنے شباب کے آغاز میں ہو جبکہ میری جوانی ڈھل چکی ہے۔ میری شادی ہوئی ہے نہ بچے ہیں اور ابھی کوئی ایسا نہیں جس سے میں دل کی باتیں کر سکوں...... مجھے بچے سکول میں آتے دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے...... ان کو جاتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے...... اسی لیے میں نے اپنی دکان کے اوقات ایسے رکھے ہیں کہ میں اداسی کے مناظر نہ دیکھ سکوں۔''

''سفر جاری ہے'' میں ایک جاندار کردار چوہدری دسوندھی خان کا ہے۔ وہ معروف گاؤں ورک کی قابل احترام شخصیت تھی۔ اس علاقے کے ذیلدار بھی تھے۔ بڑے سخی اور ہمدرد انسان تھے۔ نمود و نمائش سے پاک، ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے تھے۔ ایسے سب کردار تقریباً تمام دیہاتوں میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے بعد موجود ہوتے ہیں۔ جمیل آذر کو بھی اپنے بچپن میں ایسے کرداروں سے ضرور واسطہ پڑا ہوگا۔ اگر وہ اپنی آپ بیتی تحریر کرتے تو اپنے بچپن میں دیکھے ہوئے ایسے چند کردار ضرور پیش کرتے۔

ملک مقبول احمد نے جے۔ وی کی ٹریننگ 1950ء میں مکمل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ بورڈ پرائمری سکول کلوئے ضلع سیالکوٹ میں استاد کے عہدے پر فائز

ہو گئے۔ وہ اپنی قابلیت اور بہترین انداز تعلیم کی وجہ سے طلبا میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ بعد ازاں اپنے والد کی خواہش پر گوجرانوالہ میں پٹوار سکول میں داخلہ لے لیا۔ پٹوار کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے پرزور اصرار کے باوجود ملازمت نہ کی۔ ملازمت نہ کرنے کی دو وجوہات تھیں اول تو وہ غیر تخلیقی اور اکتا دینے والا کام ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ دوم وہ رشوت کی کمائی سے دور رہنا چاہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رزقِ حلال کے کس قدر خواہش مند ہیں۔

ملک مقبول احمد نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ جوانی کا طوفانی دور بہت نازک اور خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس طوفانی ریلے میں بہتے رہے۔ ان کی والدہ نے انہیں ازدواجی زندگی کے لیے بچپن ہی میں ننھیال میں ان کی ماموں زاد سے نامزد کر کے اس طوفانی ریلے کے آگے بند باندھ دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ جوانی کے منہ زور گھوڑے کو پوری طرح قابو نہ کر سکے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تاہم بعض اوقات دریا کے تیز بہاؤ کے سامنے کھڑا رہنا ممکن نہیں ہوتا۔
میں فرشتہ تو نہیں تھا۔''

انہوں نے کس قدر سادہ اور معصومانہ انداز میں اپنی جوانی کی طوفان خیزی کا اظہار کیا ہے کہ ان کی جوانی کی ذہنی کیفیت کو اس جملے کے آئینے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کی پہلی شادی بڑے ٹھسے سے ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ان کی بیوی نظیر بیگم بہت خوبصورت تھی اور ملک صاحب اس کی خوبصورتی سے خاصے متاثر تھے مگر کچھ عرصے کے بعد اس نے ملک صاحب کی والدہ کے ساتھ گستاخانہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ سمجھانے کے باوجود اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور ایک روز ناراض ہو کر

اپنے والدین کے پاس چلی گئی اور ملک صاحب کے سمجھانے کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ اس دوران منی آرڈر کے ذریعے اسے خرچہ بھیجا جاتا رہا۔ وہ بیمار رہنے لگی تو ملک صاحب اسے منت سماجت کر کے لاہور لے کر آئے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا وہ نہ مانی اور والدین کے پاس چلی گئی اور وہیں 1980ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دوسری شادی نہایت سادگی سے خورشید بیگم کے ساتھ ہوئی۔ اس معصوم چہرہ خاتون نے اپنے حسن سلوک سے نہ صرف ملک صاحب کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالی بلکہ ان کی والدہ کی خدمت گاری اور تابع فرمائی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اہل خانہ کی محبت کے علاوہ صفائی سے بھی اسے جنون کی حد تک پیار تھا۔ ملک مقبول احمد خورشید بیگم کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''کوئی لاکھ کہے کہ بہو ہونے کے ناتے، اپنی ساس کی خدمت کرنا خورشید کا فرض تھا اور پھر وہ اس کی پھوپھی اور پھوپھا تو تھے۔ سگھڑ لڑکیاں ایسا ہی کرتی چلی آئی ہیں تاہم میں خورشید کا ممنون احسان ہوں کہ اس نے میری بے جی کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

ملک مقبول احمد جب لاہور وارد ہوئے تو ان کے پاس سرمایہ کم تھا مگر اقبال کی شاعری سے حاصل کیا ہوا یقین محکم، عمل پیہم کا جذبہ ان کے اندر فزوں تر تھا۔ جس نے انہیں قدم آگے بڑھانے میں بڑی معاونت کی۔ انہوں نے شاہ عالم مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرایے پر حاصل کیا۔ جس میں انہوں نے ''چودھویں صدی کا دفتر بنایا اور ملحقہ حصے میں رہائش اختیار کر لی۔ ساتھ ہی پبلشنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔ ماہنامہ ''نئے زاویے'' کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا۔ پبلشنگ کے کام میں کافی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کے زیورات تک فروخت کر کے اس کام میں لگا دیے

گئے ۔ ناسازئ حالات کے باوجود ہمت نہ ہاری ۔ بالآخر ان کی جہد مسلسل، ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کی وجہ سے انہیں طباعت میں کامیابی حاصل ہوگئی اور ان کے مالی حالات رفتہ رفتہ بہتر ہوتے گئے ۔

1957ء میں مقبول اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے قیام کے بعد ہی ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کی ایک بڑی شاہراہ پر قدم رکھا تھا۔ ان کے نزدیک کتب کی اشاعت سے صرف روپیہ کمانا مقصود نہ تھا بلکہ وہ ایسی کتابوں کی تلاش میں تھے جو دلوں میں روشنی کے چراغ روشن کرسکیں ۔ ان دنوں رئیس احمد جعفری بے مثل شہرت کے باکمال ادیب تھے۔ ان کا مطمع نظر اپنے قلم کو مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کے لیے استعمال کرنا تھا۔ انہوں نے ملک صاحب کی درخواست پر دو ناولوں کے مسودے انہیں عطا کیے۔ جو اشاعت کے فوراً بعد فروخت ہو گئے اور لگایا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ واپس آ گیا۔ جعفری صاحب کے ناولوں کی فوراً فروخت سے ملک صاحب کے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوگیا۔ ابوالکلام کی خودنوشت ''انڈیا ونز فریڈم'' کا اردو ترجمہ جعفری صاحب نے ان کی درخواست پر قلیل عرصے میں ''آزادئ ہند'' کے عنوان سے کیا۔ جس کے تین ایڈیشن ایک ماہ کے قلیل عرصے میں فروخت ہو گئے ۔ اس کتاب نے مقبول اکیڈمی کو شہرت اور مقبولیت بخشی ۔ اس کے بعد کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔

ملک صاحب نے چار مرتبہ حج اکبر اور کئی حج اصغر ادا کیے۔ جن کا ذکر انہوں نے مختصر الفاظ میں اپنی آپ بیتی میں بھی کیا ہے۔ جمیل آذر کو بھی حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے جس کا ذکر راہ نوردِ شوق میں موجود ہے۔

1965ء میں بھارتی فوج نے سیالکوٹ کی سرحد پر دھاوا بول دیا اور ملک صاحب کا گاؤں دیووال ان کے قبضے میں چلا گیا۔ بھارتی فوج نے وہاں بے پناہ تباہی مچائی

اور لوگوں پر ظلم وستم کیے۔انہوں نے ملک مقبول احمد کی بیمار پھوپھی کے سر کے بال منڈوا دیئے۔ان کی پھوپھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھیں اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور کے ایک ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ملک مقبول احمد اس وقت لاہور میں تھے اور بے بسی کا شکار تھے۔ 1979ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے نو سال بعد ان کے والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 1989ء میں وہ گلشن اقبال علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ان کے گھر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو گھر کا سامان لے گئے اور ان کی ملازمہ کو زخمی کر گئے۔اس واقعہ سے گھر کے لوگ اتنے خوف زدہ ہوئے کہ وہ مکان بیچ کر جوہر ٹاؤن میں دوسرا مکان خرید لیا۔ 1990ء میں رائیونڈ کے قریب 113 کنال اراضی خریدی تاکہ وہاں کاغذ بنانے کی فیکٹری لگائی جائے مگر یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ان حادثات کے باوجود انہیں پبلشنگ شعبے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔جس کا اعتراف بین الاقوامی مارکوئیس پبلشنگ بورڈ نے بھی کیا اور ان کا اسمائے گرامی 1999ء کے چھٹے ایڈیشن میں شائع کیا۔ملک مقبول احمد کی حسن وصداقت کی اس داستان کے بارے میں پروفیسر جمیل آذر ''راہ نوردِ شوق'' کے آخری صفحہ 264 پر لکھتے ہیں۔

''اب پتہ نہیں میری یہ کتاب ان کی سوانح حیات ہے یا میری یا ہم دونوں کی یا ہمارے پورے معاشرے کی جس میں ہم سب رہ رہے ہیں اپنی پوری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ۔میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک مقبول احمد کی داستان حیات حسن وصداقت کی کہانی ہے۔حسن سچ ہے اور سچ ہی حسن ہے۔''

امید واثق ہے کہ ''سفر جاری ہے'' کی طرح یہ کتاب بھی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی اور اسے پڑھ کر اصل سوانح حیات کا سا لطف آئے گا۔

صائمہ نورین بخاری
ضلع خانیوال ڈویژن ملتان

''نارسی سس سے راہ نوردشوق تک''

انسان جو کچھ سوچتا ہے حقیقت ایسی نہیں ہوتی اور اگر وہ حقیقت سے سمجھوتہ کر بھی لے تو ضروری نہیں کہ حقیقت اس کی گرفت میں آجائے۔تنقید ایک خواہش ہے اور ایک حقیقت بھی، فرق صرف اتنا ہے کہ اس حقیقت کو بیان کرنے والے کا اپنا فنی مقام کتنا بلند ہے۔لفظوں سے فن پارے وجود میں آتے ہیں۔تاریخیں بنتی ہیں اور تاریخ سازی کے دو اہم ستون تنقید اور توصیف قرار پاتے ہیں۔معیاری تنقید کسی بھی مصنف فلسفی، شاعر و ادیب کے فن کو چار چاند لگا سکتی ہے یا پھر اس کو عرش سے فرش پر پہنچا سکتی ہے۔

لفظوں کو منطق کے دائرے بخشنے والے تنقید نگار اچھے منطقی اور مابعد الطبعیاتی دونوں ہوتے ہیں کیوں کہ تخلیق ایک وجدانی کیفیت ہے۔لہٰذا تنقید بھی اسی وجدان کی تشریح کا نام ہونا چاہیے۔تنقید، علم کے بغیر بے معنی ہے اور علم، تحقیق کے بغیر نامکمل، ایک وقت تھا جب ادب میں فارم کی بڑی اہمیت تھی۔کامیڈی، ٹریجڈی، اور غنائیہ جیسی اصناف ادب کو فارم مانا جاتا تھا۔۔۔۔اور اس کے مطابق کسی نئی تصنیف کو منطقی بنیادوں پر پرکھا جاتا تھا کیوں کہ منطقی تنقید کے بانی ارسطو کا فلسفہ بھی منطقی تھا۔لہٰذا اس کی تقلید میں جو بھی تنقید کی گئی وہ تمام تر منطقی ہی تھی۔مگر سترہویں صدی کے وسط میں جب انگریزی ڈرامہ ایک ''فارم'' کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تو تنقید نے توصیف کی راہ اختیار کر لی جیسے ڈرائڈن کی تنقید بن جانسن اور شیکسپئر پر ملاحظہ کیجئے تو واضح ہوتا ہے کہ تنقید ''ڈفینسو'' ہے مگر منطق کے دائرے

سے باہر نہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے اختتام تک یہ مانا گیا کہ اچھا نقاد وہی ہوتا ہے جو توصیفی منطق سے بھی مکمل طور پر واقف ہو لیکن تنقید کا یہ نظریہ بھی زیادہ مقبول نہ ہو سکا اور ارسطو کی منطق کی جگہ جرمن فلسفیوں کی میٹا فزکس نے لے لی۔

انیسویں صدی کے وسط میں میتھو آرنلڈ کے اس نظریے کو تقویت پہنچی کہ ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ تخلیق کاروں سے الہامی تعلق قائم کرے اور اس وجدانی کیفیت کو خود پر طاری کر کے دیکھے، پھر گہرائی جانچے..... یہ نظریہ ایک لحاظ سے اس دور کی شروعات کا غماز تھا جو سائنس اور فکشن پر مبنی تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں سائنس نے ہر شعبہ علم کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

بہر حال تنقید ایسا ارتقائی عمل ٹھہرا جو فن فطرت کا ہی ایک حصہ نظر آتا ہے..... ہومر سے لے کر فیض تک ہر قوم اور ملک کے تخلیق کاروں پر ان کے فن پر رائے زنی کی گئی..... اور ایسی تنقید جو استقراری حالت میں اَدب کا علمی وفنی جائزہ لیتی اور فن کے اصولوں کو فن کار کے فنی عمل میں تلاش کرتی ہے بالآخر مقبول ہوئی......

کہا جاتا ہے کہ اُردو اَدب میں حاؔلی کے بعد کوئی قابل قدر نقاد پیدا نہیں ہوا، کیوں کہ ہمارے ہاں تنقید اور لوگوں کا کام ہے اور فن پارہ تخلیق کرنا اور لوگوں کا..... تنقید کے علمی زاویوں کو شیشوں کی طرح برت کر لوگ تنقید نگار ہو جاتے ہیں۔ لیکن دل چسپ امر یہی ہے کہ ارسطو سے لے کر حالی تک اور حالی سے لے کر پروفیسر جمیل آذر تک علمی حصہ اتنا مقبول نہیں جتنا فنی حصہ کیوں کہ فن ہی تنقید کی جان ہے۔

اور تنقید میں محبت آشنائی، اسلوب کی تازگی نشاطِ فکر میں روحانی آسودگی جب تنقید کا معیار ٹھہرے تو انشائی تنقید وجود میں آتی ہے۔ اور جب انشائی تنقید کا نام لیا جائے تو

موجودہ عہد میں ایک نہایت محترم و معتبر نام روشن ستارے کی حیثیت سے آسمانِ ادب پر تابندہ نظر آتا ہے..... وہ محترم نام ہے جناب پروفیسر جمیل آذر کا۔

پروفیسر جمیل آذر انگریزی اَدب کے قابل قدر استاد، منفرد نقاد اور بلند پایہ انشائیہ نگار ہیں..... انشائیہ نگاری کی بے مثال صنف اَدب میں اپنا بلند معیار قائم رکھتے ہوئے انہوں نے اہل ذوق کو انشائیوں کی تین کتابیں ''شاخ زیتون''، ''رُت کے مہمان'' اور ''وقت اے وقت'' رقم کر کے تحفہ کیں اور اہل ادب سے خراجِ تحسین حاصل کیا..... علاوہ ازیں پروفیسر جمیل آذر ایک نئے اور منفرد دبستان ''انشائی تنقید'' کے قافلہ سالار بھی ہیں اور ''انشائی تنقید'' میں انہوں نے ''راہ نوردِ شوق'' کی صورت میں ایک خوب صورت عملی تفسیر پیش کی ہے انہوں نے ''انشائی تنقید'' کی بنیاد تخلیق، تخلیق کرتی ہے۔'' پر رکھی۔ فرانسیسی نقاد رولینڈ بارتھرز (Roland Barthers) کے ہاں ''لکھت'' لکھتی ہے جبکہ انشائی نقاد کے ہاں ''کتاب، کتاب لکھی ہے۔'' لفظ ''انشاء'' کے معنی ''تخلیق'' ہیں لہٰذا پروفیسر جمیل آذر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں.....

> ''انشائی نقاد کے ہاں اَدب پارے کو پرکھنے، جانچنے اور سراہنے کے سارے پیمانے، قاعدے، کلیے، نظریات و تصورات، خارجی مروّجہ تنقیدی رویوں کے برعکس اس کے باطن سے پھوٹتے ہیں.... وہ خارجی ٹولز (Tools) کا محتاج نہیں ہوتا.....''

جمیل آذر اپنی انشائی تنقید کے تصور (concept) کی بنیاد کلیاتی (Holistic) اور وحدتی (Monistic) کی اس سرحد پر رکھتے ہیں جہاں تخلیق و تنقید کی تخصیص ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ڈوبتی شام کے حسین منظر میں اُفق کے پار، سمندر اور آسمان ایک نظر آتے ہیں.... اور اس کی وضاحت وہ دیو مالائی کردار نارسی سس کی حسین مثال سے اس طرح کرتے ہیں لفظ

(Contemplation) اپنی بھرپور معنویت کے دریچے وا کر دیتا ہے۔

''دیو مالائی کردار وجیہہ صورت نارسی سس ایک حسین جھیل کے کنارے اپنے حسن و جمال کا نظارہ کرتا تھا۔ ایک روز وہ غور و فکر میں اتنا جذب تھا کہ وہ جھیل میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا..... جنگل کی دیویاں جب نارسی سس کے تعاقب میں جھیل پر آئیں تو اس اُداس جھیل کا سارا پانی نمکین آنسوؤں میں تبدیل ہو چکا تھا.... دیویوں نے جھیل سے پوچھا کہ کیا تم وجیہہ نارسی سس کے غم میں آنسو بہا رہی ہو..... جھیل نے جواب دیا ''میں نے کبھی غور نہیں کیا وہ خوب صورت تھا۔ میں تو اس لئے روتی ہوں کہ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں.... میں اپنے حسن کو منعکس ہوتا دیکھتی تھی.....اب میں اس سے محروم ہوگئی ہوں۔''

اس دل آویز استعارہ کی طرح پروفیسر جمیل آذر نے ایک فن پارے کو اپنی نظروں میں منعکس پایا۔ اور ان کا قلم ''انشائی تنقید'' کے تصور میں غرق ہو کر ایک نئے حسین سفر کی جانب گامزن ہوا......

''سفر جاری ہے'' جناب ملک مقبول احمد کی وہ کتاب ہے جسے ہندو پاک میں پذیرائی نصیب ہوئی۔ ملک مقبول احمد نے اپنی جیون بیتی کیا لکھی..... اہل قلم و اہل فہم کے لئے اپنی سادہ دلی، بلند ہمتی، امانت، محنت، تدبر و فراست، صداقت اور دیانت کی مثال قائم کر دی۔ اور پروفیسر جمیل آذر صاحب نے ''راہ نوردِ شوق'' لکھ کر انشائی تنقید میں ایک نئی مثال رقم کر دی.....

وجدانی جمالیات، لوک داستانیں، انسان دوستی، امن و سلامتی کی تلاش، گم گشتہ معصوم دیہی تہذیب و تمدن کے آثار، حسن و عشق سے لبریز رویئے، اندازِ بیان میں آب رواں کی سلاست و روانی، ریگ زاروں کے عبادت گزار ایسی عاجزی، گاؤں کی کچی مٹی کی

خوشبو، سبزے کی لہلہاہٹ، تحریر کی آفاقیت اور انسانی رویوں سے پھوٹتے فکری آفاق، گویا حسین یادوں کی جھیل جس میں اگر ایک سچا ادیب اپنا عکس دیکھے تو اس کے حسن میں غرق ہو جائے .... یہ سب صداقتیں جب کتاب کے مقدس روپ میں ڈھل جائیں تو ''سفر جاری ہے'' کہلاتی ہیں اور جب ادیب نارسی سس بن کر حسن تخلیق میں گم ہو کر قلم اٹھاتا ہے تو ''راہ نوردِ شوق'' جمال افروز ہوتی ہے۔

پروفیسر جمیل آذر نے ملک مقبول احمد کی (Inspiring Personality) کے سحر میں گم ہو کر، اپنی رومان پرور، دل نواز اور مشفق شخصیت کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے ملک مقبول احمد کی امر کہانی کے ساتھ خود کو بھی امر کر دیا...... اور وہ اس کی وضاحت گوئٹے کے ڈرامہ (Faust) کے اس شہرہ آفاق جملے سے کرتے ہیں۔

"All that is transitory but an image the unattainable here becomes reality."

ہر چیز عارضی ہے سوائے اس ایک امیج کے جو اگرچہ ناقابلِ حصول ہے مگر حقیقت ہے۔

پروفیسر جمیل آذر نے ملک مقبول احمد کی سوانح حیات میں اپنے جیون کے حسین ''images'' دھنک رنگوں کی طرح سے محسوس کئے ..... ان کی جائے پیدائش انبالہ (بھارت) کی روحانی انبساط سے بھرپور یادیں ایک سنہری رُت کی مانند ان کی آنکھوں میں اترتی رہیں..... جب چاندنی رات میں آسمان پر اون کی طرح اڑتے بادل، دریا کے کنارے، چاندنی میں چمکتی سفید کشتی، فطرت کے حسن اور خوف سے شرابور احساسات انہیں (Pantheism) فلسفہء وحدت الوجود اور حسن فطرت کے عظیم رومانوی شاعر ورڈز ورتھ کی یاد دلاتے ہیں تو ان کا دل ماضی کے ان حسین تصورات کی وادی میں بھٹکنے لگتا ہے ایسی وادی جہاں (Mystic Mysteries) اور روحانی بصیرت کا حصار Engery of love, کی کرامات، مدور رقص (Round Dance) کا وجد، ان کو

اپنے حصار میں رکھتا تھا۔ جہاں مختلف مذاہب کے لوگ خلوص، محبت اور امن سے رہتے تھے۔ وہ ''سفر جاری ہے'' کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کا سفر شروع کر دیتے ہیں جہاں حسن، زندگی اور موت اسرارِ کائنات کی منزلیں ٹھہرتی ہیں ان کی زندگی کے نشیب وفراز کا ایسا سفر جہاں عاجزی کی دانش حاصل کرنے کی امید، جواز کامیابی اور نشانِ منزل ٹھہرتی ہے۔

''راہ نوردِ شوق'' انشائی تنقید کا وہ شاہکار ہے جس میں اسلوب بیان کی سلاست اور روانی بنیادی اوصاف ہیں۔ جمیل آذر نے اندازِ بیاں میں ابلاغ کو اہمیت دی ہے۔ انہوں نے یادوں کی اس جھیل کا عکس اس طرح اپنی آنکھوں میں اترتا ہوا محسوس کیا ہے کہ ماضی کی سنہری یادیں ان کی نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر بکھرتی چلی گئیں.....
ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح عمری میں انہوں نے اپنے جیون کے دل آویز منظر بھاگتے دوڑتے محسوس کیے ہیں۔ جیسے زندگی کی گاڑی میں سفر کرتے ہوئے وہ حسین منظر جو سڑک کے کنارے دوڑتے بھاگتے، درختوں، خوش رنگ جھاڑیوں، خوشنما پھولوں، آسمان پر اُڑتے بادلوں اور خوش نوا پرندوں کی طرح ہماری زندگی میں کچھ لمحوں کیلئے آتے ہیں۔ نظروں کے سامنے کچھ اس طرح گزر جاتے ہیں کہ ہم ان کو پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا چاہیں تو سامنے آنے والا منظر ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی ایک عظیم تخلیقی کاوش سے بڑھ کر ادب کے مرغزار کی وہ حسین جھیل ثابت ہو رہی ہے جس میں برصغیر کے نامور ادیب اپنا عکس دیکھ رہے ہیں.....

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور



ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور

دسمبر 2008ء

راہ نوردِ شوق

کوئی سال دو اُدھر کی بات ہے مقبول اکیڈمی لاہور کے پروپرائیٹر جناب ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' عنوان سے منظرِ عام پر آئی۔ شاعر، ادیب، صحافی، سیاستدان اور افسران تو آپ بیتیاں قلم بند کرتے رہتے ہیں لیکن کسی پبلشر کی ایسی کتاب شاید ہی کبھی نظر سے گزری ہو۔ مذکورہ آپ بیتی میں زبان و بیان کے حوالے سے بہت خوبیاں تھیں لیکن جس خوبی نے اہلِ ذوق کو بے حد متاثر کیا وہ دیہاتی زندگی کی نقشہ کشی کی تھی۔ تقریباً ایک سو ادیبوں نے ''سفر جاری ہے'' کو پڑھا اور باقاعدہ اس پر تحریری آراء پیش کیں جو کتابی صورت میں ''پذیرائی'' کے عنوان سے شائع ہوگئیں۔

''سفر جاری ہے'' پڑھنے کے بعد پروفیسر جمیل آذر کو ملک مقبول احمد کے بارے میں باقاعدہ ایک کتاب لکھنے کی تحریک ملی جس کی بنیاد ملک صاحب کی آپ بیتی ہے۔ لیکن انداز روایتی تنقید والا نہیں۔ کسی خاص دبستانی تنقید سے بھی کام نہیں لیا بلکہ صرف اپنے تاثرات رقم فرمائے ہیں، کئی اُردو شہ پاروں کو انگریزی میں ڈھال چکے ہیں۔ ان کی تحریر کا خاص میدان انشائیہ نگاری ہے۔ انہوں نے جس سپرٹ کے ساتھ انشائیے لکھے ہیں اسی سپرٹ کے ساتھ وہ تنقید بھی لکھتے ہیں۔ اس میں شک بھی کیا ہے کہ تخلیق پہلے پہل ہمارے باطن سے اعتبار رکھتی ہے، اس کے بعد ہی شعور اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ اس لیے جمیل آذر کی تنقید ''انشائی تنقید'' کہلاتی ہے۔ راہ نوردِ شوق دراصل انشائی تنقید کا ایک نہایت دلچسپ نمونہ ہے۔

ایک اقتباس پیش خدمت ہے، اسی سے آپ انشائی تنقید کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جمیل آذر رقمطراز ہیں:

''ساغر صدیقی کے تعارف کرانے میں ملک مقبول احمد نے کمال ہی کر دیا۔ اتنا خوبصورت جامع اور شعریت سے لبریز کہ مزہ آ گیا۔ ساغر صدیقی شاعر تھا تو اس کا تعارف اس کے شعر ہی سے کراتے ہیں۔

''صحن چمن میں ساغر کس نے
پھینک دیئے ہیں پھول مسل کے

اس شعر کا خالق ساغر صدیقی غزل کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اس کی شاعری میں زندگی کا حقیقی تجربہ موجود تھا۔ اس کی غزل نوائے سروش تھی۔ زندگی کے راستے سے اکھڑا تو ساغر صدیقی کی زندگی سگریٹ کا ایک کش بن کر رہ گئی۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں گیلانی پریس کے مالک سید مبارک علی شاہ کے صاحبزادوں کے ہاں بوریاں بچھا کر وقت گزارتا تھا۔ اس کا یہ مسکن چونکہ مقبول اکیڈمی کے قریب تھا۔ اس لیے آتے جاتے اتنی فقیرانہ اور درویشانہ صدا بلند کرتا اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں



نوائے وقت

ڈاکٹر انور سدید

26-10-08

راہ نوردِ شوق

''راہ نوردِ شوق'' اُردو کے ممتاز دانشور، انشائیہ نگار اور نقاد پروفیسر جمیل آذر کی تالیف لطیف ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف بھی افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ محترم مؤلف نے لکھا ہے:

''راہ نوردِ شوق'' میرے انشائی تنقید کے تصور (Concept) کی عملی تفسیر ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح میں نے اس معزز شخصیت (ملک مقبول احمد) کو دریافت (Discover) کیا ہے اور انہیں محبت و احترام سے دیکھا ہے، آپ بھی انہیں ایسا ہی پائیں گے اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔''

''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے اپنی ذات کو اپنے آئینے میں منعکس کیا ہے۔ ''راہ نوردِ شوق'' سے جو مقبول احمد برآمد ہوتا ہے اس کا آئینہ جمیل آذر کی دسترس میں ہے۔ ملک صاحب کی واقعاتی زندگی کی شہادت جمیل آذر نے اپنی دیہاتی زندگی سے پیش کی ہے۔ معنوی طور پر یہ دو اشخاص کی زندگی پر مشتمل کتاب ہے یعنی اس میں ملک مقبول احمد کی سوانح ہے تو یہ جمیل آذر صاحب کی خود نوشت بھی ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس قسم کا تجربہ کبھی عمل میں نہیں آیا جیسا پروفیسر صاحب نے کر دکھایا۔ اس انوکھی تخلیق کاری کے لئے میرے پاس تعریف و تحسین کے لئے موزوں الفاظ نہیں ہیں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں ''ویل ڈن جمیل آذر''۔



''نوائے وقت''

راہ نوردِ شوق

مقبول اکیڈمی لاہور کے ملک مقبول احمد ممتاز کے ممتاز ناشر ہیں۔ جنہوں نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں شائع کی ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' کے نام سے انہوں نے اپنی سوانح عمری لکھی اور ان مشکلات پر روشنی ڈالی جن کا انہیں قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے مشکلات سے ہار نہیں مانی بلکہ ان کا پامردی سے مقابلہ کیا اور **اللہ تعالیٰ** نے انہیں کامیابیوں سے نوازا۔ ان کی سوانح عمری بڑی دلچسپ ہے۔ اور بڑے بڑے صحافیوں ادیبوں اور شاعروں نے اسے سراہا ہے۔ 86 حضرات نے اس پر مضامین لکھے وہ بھی پذیرائی کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ملک کے صف اول کے انشائیہ نگار اور نقاد پروفیسر جمیل آذر نے اس بارے میں انوکھا تجزیہ کیا ہے۔ جمیل آذر نے ''سفر جاری ہے'' کا مطالعہ کیا تو انہوں نے لفظوں، متن، واقعات اور سانحات کے آئینے میں اپنے ہی حالات اور فکر ونظر کے حسن کو منعکس ہوتا پایا۔ اور وہ مسحور ہوئے۔ کتاب پر مضمون لکھا جو پذیرائی میں شامل ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر انور سدید نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس پر کتاب لکھیں۔

''چنانچہ انہوں نے راہ نوردِ شوق، کے نام سے پوری کتاب لکھ دی۔

اس میں جمیل آذر کی اپنی خودنوشت بھی شامل ہوگئی۔اردو میں غالباً پہلی کتاب ہے جس نے ایک دوسری کتاب کے مطالعہ سے جنم لیا۔اس لحاظ سے یہ ایک منفرد کتاب ہے اور جمیل آذر کے مسحور کن اور خوبصورت اندازِ بیان نے اس کتاب کو چار چاند لگا دیئے۔



شناسائی

بحثیت ایک لکھاری کے میں جب اپنی زندگی کا حساب کرتی ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ چالیس سال کے دوران میں کوئی قابلِ قدر چیزیں نہیں لکھ پائی۔

مجھے یہ احساس ہے کہ کوئٹہ جیسی دور افتادہ جگہ سے جب نقل مکانی کر کے لاہور آنے پر مجھے شوق تھا اُن تمام ادیبوں کو دیکھوں جن کی تحریریں میں بچپن سے فورٹ سنڈیمن لائبریری میں پڑھتی رہی تھی۔ احمد ندیم قاسمی، رئیس احمد جعفری اور ایم اسلم سے ملوں گی۔ لکھنے کا شوق تو میں پتھر کے دیس کوئٹہ سے ہی لے کر آئی تھی۔ سب سے پہلے کچھ کہانیاں افسانے لکھے اور پہلا ناول شالی لکھ کر بغل میں دبا کر مقبول اکیڈمی کے آفس کی سیڑھیاں چڑھ کر مقبول صاحب کی خدمت میں ناول کا مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے کمال شفقت سے کتاب رکھ لی پڑھنے کے بعد چھاپنے کے بارے رائے دوں گا۔ مہینے بھر کے بعد میں پھر سیڑھیاں چڑھ کر مقبول اکیڈمی پہنچی۔ تو پوچھا کیا بنا میرے ناول ''شالی'' کا۔ ناول واپس کرتے ہوئے مقبول صاحب نے کہا:

اسے دوبارہ پڑھ کر پھر لکھیں۔ اور پھر لائیں اس کے بعد ہر دو سال کے بعد میرا مقبول صاحب سے رابطہ رہا۔ وہ میری کبھی چائے یا بوتل سے تواضع کرتے۔ وہ شکل سے

کسی صورت پبلشر جیسے نہیں لگتے تھے۔ مہربان سا لہجہ پھر چند سال بعد پھر ایک ناول لے کر حاضر ہوئی ''سعدیہ'' میرا پہلا ناول چھپا۔ تو میں بیحد خوش ہوئی۔ اس کے بعد مقبول صاحب کے یہاں سے میرے متعدد ناول چھپے۔ میرے جیسی نئی لکھنے والی کے لئے کتاب کا چھپنا میرے لئے اعزاز تھا۔ مقبول صاحب کا رویہ مجھ سے ہمیشہ اپنائیت اور محبت کا رہا۔ مجھے کبھی خیال نہیں آیا۔ میں کسی اور ادارے میں قسمت آزمائی کروں۔ مقبول صاحب کے آفس میں کئی معروف لکھنے والوں سے انہوں نے مجھے متعارف کرایا۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ ہر نئی چھپنے والی کتاب مجھے دیتے۔ قمر نقوی کی تحریریں پڑھ کر میں نے ان سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ ''بی بی یہ کوئی خاتون نہیں مرد ہے'' پھر کیا میں ضرور ملوں گی نقوی صاحب امریکن شہر میں کسی عہدے پر فائز تھے۔ مال روڈ پر اُن کے آفس میں ملاقات ہوئی۔ ٹھنڈے ماحول میں مشروب سے انہوں نے میری تواضع کی۔

سچ تو یہ ہے کہ مقبول صاحب کو میں نے ہمیشہ ہمدرد دوست سمجھا۔

میرے دکھ سکھ کو بیحد اپنائیت سے سنتے میں کئی کتابوں پر کڑی تنقید کرتی کہ اتنے اونچے معیار کی کتابیں چھاپتے ہوئے آپ نے یہ کیا کوڑا کباڑ چھاپ دیا ہے۔ مگر وہ ہنس کر کہتے اس کی بھی مانگ ہے۔

مقبول صاحب کو سب سے پہلے اُن کی جدوجہد اور بحیثیت پبلشر آپ بیتی لکھنے کا مشورہ دیا۔ پھر کئی سال بعد جب اُن کے پوتے اور نواسی حضرات نے حوصلہ افزائی کی تو پھر کتاب مرتب ہوگئی۔ جو مقبول صاحب کی ایماندارانہ جدوجہد کی طویل داستان ہے پھر اگلی کتاب میں تمام لکھنے والوں نے مقبول صاحب کو اپنی تحریروں اور خطوں کے ذریعے داد دی۔ اتنی اعلیٰ اور عمدہ تحریروں کا بھلا میں کیا مقابلہ کرسکتی تھی۔ اس لئے قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

شاہ عالمی میں کرائے کی جگہ پر مقبول صاحب جب مصروفِ کار تھے اس وقت

سے میری مقبول صاحب سے رائٹر اور پبلشر کا رشتہ ہے۔ آج کے دور میں انہوں نے مجھ جیسے چھوٹے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر کے مجھے آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ میرا اور مقبول صاحب کا طویل واسطہ ہے میرا پہلا ناول بھی یہاں سے چھپا اور امید ہے آخری کتاب بھی اسی ادارے سے چھپے گی۔ ان شاء اللہ

شبانہ یونس



دائیں سے: اختر شمار، خواجہ زکریا، اظہر جاوید، بشریٰ اعجاز، نادیہ بخاری، عمرانہ مشتاق، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر کیول دھیر اور ملک مقبول احمد



جمید اختر اور ملک مقبول احمد ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری بخاریؒ کے ہمراہ



پرویز روشن اوار علامہ عبدالستار عاصم ملک مقبول احمد چیئر مین مقبول اکیڈمی کو
لائف اچیومنٹ ایوارڈ دے رہے ہیں۔ ساتھ جمیل اختر چوہدری کھڑے ہیں۔



ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر سید حسن عسکری اور ملک مقبول احمد



عظیم آراء فاؤنڈیشن کی جانب سے مقصود احمد چغتائی، علامہ عبدالستار عاصم اور اکرام اللہ عادل ملک مقبول احمد کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ دے رہے ہیں۔



پرویز روشن کی رہائش گاہ پر ملک مقبول احمد کرسمس کے موقع پر غریب مسیحیوں کو گفٹ دے رہے ہیں



العجم بوائے سکاؤٹس کے زیر اہتمام عطاء قاضی کی کتاب ''اشکوں کی لو'' کی تقریب رونمائی کے موقع پر ملک مقبول احمد صدارتی خطبہ دے رہے ہیں۔ ساتھ علامہ عبدالستار عاصم کھڑے ہیں جبکہ سٹیج پر مقصود احمد چغتائی، میاں محمد سعید شاد اور ڈاکٹر انور سدید تشریف فرما ہیں۔



علامہ عبدالستار عاصم، ملک مقبول احمد، ڈاکٹر انور سدید، مقصود احمد چغتائی اور کرامت بخاری



ملک مقبول احمد اور ڈاکٹر کیول دھیر مقبول اکیڈمی کے آفس میں



عبدالمجید منہاس، سعید بدر، ملک مقبول احمد، علامہ عبدالستار عاصم، مقصود احمد چغتائی



مسیحی رہنما چراغ روشن اور پرویز روشن کی رہائش گاہ پر جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰؑ کے
یوم پیدائش کے حوالہ سے ملک مقبول احمد، حمید اختر، مفتی غلام سرور قادریؒ، حافظ حسین احمد
اور چراغ روشن کرسمس کا کیک کاٹ رہے ہیں۔

خودنوشت

''سفر جاری ہے''

مشاہیر کی آراء سے اقتباسات

ملک مقبول احمد نے ایک طویل سفر کی داستان ''سفر جاری ہے'' لکھ کر دریا کو تاریخ کے ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد نے اپنا فن، علم اور تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لیے مشعل راہ بنائے رکھے۔ (آمین)

ڈاکٹر عبد القدیر خان (ایٹمی سائنسدان)

''ملک مقبول احمد کی سوانح حیات یہ ثابت کرتی ہے کہ عقلِ سلیم اور دانش کا تعلق کالج یا یونیورسٹیوں کی ڈگری پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ کا عطیہ ہوتا ہے۔''

شیخ ریاض احمد

چیف جسٹس آف پاکستان (ر)

''ان کا اسلوب نہایت دلچسپ ہے، ان کی زبان و بیان اور طرزِ تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے جو ان کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔''

ڈاکٹر صفدر محمود

(مؤرخ پاکستان)

''یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ملک مقبول احمد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر وحید قریشی

''ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی لکھ کر اہلِ نظر کے سامنے اپنی زندگی کی کہانی پیش کر دی ہے اور فیصلہ زمانے کی تیز نگاہی پر چھوڑ دیا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا

''اس کتاب میں مصنف نے اپنی بھرپور جدوجہد کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

حمید اختر

ملک مقبول احمد کی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پڑھنے کو ملی۔ اس کتاب کے شروع میں انہوں نے ''روسو'' کی تحریر سے جو اقتباس درج کیا ہے۔ یہ کتاب اس پر پوری اترتی ہے۔ مقبول صاحب نے اپنی ذات کے بارے میں سچ ضرور بولا ہے لیکن بڑی سادگی کے ساتھ، انہوں نے ذاتی سچ کو افسانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔

بانو قدسیہ

''خود آگہی ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف وہ ہستیاں پہنچ پائیں جو ہمت و استقلال کا پیکر تھیں۔ اس منزل پر پہنچنے والی ان ہستیوں میں ''سفر جاری ہے'' کے مصنف ملک مقبول احمد شامل ہیں۔''

عباس خان جسٹس (ر)

''مقبول صاحب نے اپنے حالات، مشاہدات اور تجربات ایسے انداز میں لکھے ہیں، کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے، یہ جیون کتھا بہت سے لوگوں کے لیے باعث نفع وافادہ ہوسکتی ہے۔''

خواجہ محمد زکریا

''سفر جاری ہے'' ایک اعلیٰ پائے کی کتاب ہے اور ملک مقبول احمد کی کہانی ہر شخص کی کہانی بن سکتی ہے۔ ہر شخص کو آگے بڑھا سکتی ہے اور کامیابی کا چہرہ دکھا سکتی ہے۔''

مجیب الرحمن شامی

''اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زیب داستان سے کام نہیں لیا گیا لیکن اس میں افسانے جیسی لطافت موجود ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید

''یہ گوناگوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ اس دور کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظر نامہ بھی بن گئی ہے، جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔''

امجد اسلام امجد

''بحیثیت مجموعی ''سفر جاری ہے'' اُردو سوانح نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہے اور اس پیشکش میں جس اہتمام کو مدنظر رکھا ہے وہ قابل تحسین ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد

''یہ کتاب دلچسپ واقعات، لطیف جذبات، حسین تخیلات سے مالا مال ہے اس کتاب کا ہیرو زاہد خشک نہیں وہ زندگی کی تمام رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔''

پروفیسر جمیل آذر

''کتاب کے مطالعہ کے دوران میں بعض جملوں، نے مجھے چونکا دیا ہے، ایسے جملے کوئی عام نثر نگار، جب تک اس کے اندر تخلیق کی شمع روشن نہ ہو، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔''

محمد منشا یاد

''واہ کیا کتاب لکھی ہے آپ نے، اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ پھر میں کیا لکھوں گا تو میں آپ سے ضرور کہتا کہ اس طرح کی ایک آپ بیتی میری بھی لکھ دیجیے۔''

اے حمید

آپ کی سوانح ''سفر جاری ہے'' میرے لیے فردوسِ نظر بنی، جس مہارت سے زندگی کے مشاہدات و تجربات کو آپ نے قرطاس پر اُتارا ہے، لائق تحسین ہے۔ میرے لیے یہ بات بھی کسی کرامت سے کم نہیں کہ ساغر صدیقی کی پوری زندگی کو آپ نے پندرہ سطروں میں بیان کر دیا ہے۔

جبّار مرزا

''مجھے آپ کی خودنوشت بہت پسند آئی، واقعی آپ عزم وہمت کی قابلِ تقلید مثال ہیں۔ مصاف زندگی میں ایسی عمدہ مثال بننا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر علی محمد خان

''اپنی شخصیت اور علم پروری کی داستان ملک مقبول احمد نے جمالیاتی ذوق کی آئینہ داری کے ساتھ سنائی ہے۔ جس میں بہت کچھ سیکھنے جاننے کا گوناگوں برق تجلی ہے۔''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

''سفر جاری ہے'' اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ایک سیدھی سادی زندگی کا بے ریا بیان ہے جو مطالعہ کے دوران دل میں اُترتا چلا جاتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ اپنے کھلے پن میں بھی ٹھکانے سے دور پار کہیں کھو نہیں جاتا۔''

جوگندر پال

''اس کے پس پردہ تجربات، نیک و بد، خیر و شر، محبت و گل کی ایسی لطیف داستان پوشیدہ ہے کہ قاری لاشعوری طور پر معرفت کی دُنیا میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔''

پروفیسر علی احمد فاطمی

''سفر جاری ہے'' میں ملک مقبول احمد نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سدرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

ڈاکٹر طارق عزیز

''سفر جاری ہے'' میں اظہار کی زبان سادہ اور معصوم ہے، معلوم ہوا کہ مصنف شعر فہم بھی ہیں۔ اچھے شعر برمحل استعمال کیے گئے ہیں۔''

اظہر جاوید

''سفر جاری ہے'' ایک خودنوشت سوانح حیات ہی نہیں، ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی دستاویز بھی ہے۔''

ڈاکٹر یونس جاوید

''یہ داستانِ حیات ہر ذی شعور کے لیے راستی اور حق شعاری کا ایک انمول خزانہ رکھتی ہے۔''

پرتو روہیلہ

''آپ کے مشاہدہ میں گہرائی، ظرف میں وسعت اور اندازِ بیان میں دلکشی ہے، سفر جاری ہے سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کی داستان ہے۔''

ڈاکٹر مسکین علی حجازی

''سفر جاری ہے'' حوصلوں کو تقویت اور نئی نسل کے لیے رہنمائی عطا کرنے والی کتاب ہے۔ جسے معاشرے کی سرکردہ، بزرگ، جینیئس اور صادق و امین ہستیوں نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''سفر جاری ہے'' استقامت اور جہدِ مسلسل کا استعارہ ہے۔

ملک محمد محبوب الرسول قادری

''سفر جاری ہے'' کا مطالعہ شروع کیا تو تحریر کے طلسم نے ایسا اسیر کیا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کسی بھی ادب پارے کا حسن روح کو مس کر جائے تو مدتوں سرشار رہتا ہوں۔''

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

''ملک مقبول کی ادبی سرگزشت کی خوشبو ادب پرور گہوارہ لاہور کے کونے کونے میں محسوس کی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر ریاض محمود

''ہمیں اپنے ایک دوست کی لکھی ہوئی اچھی اور دلچسپ کتاب پڑھنے کو ملی اور یہ کتاب چھپ کر کتابوں کی اشاعتی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔''

سید قاسم محمود

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی خودنوشت آپ بیتی ہے، جو انہوں نے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے ایسے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے کہ قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔''

طالب ہاشمی

"سفر جاری ہے" کے آئینہ خانے میں بہت سی معلومات ایک تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ یوں اسے ایک مکمل خودنوشت سوانح عمری کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اسے فن خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک حسین اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔"

پروفیسر نظیر احمد تشنہ

"سفر جاری ہے" بیک وقت کلیدِ کامیابی بھی ہے اور اپنے دائرے کے اندر تاریخ بھی اور آئندہ نسل کے لیے خضرِ راہ بھی۔"

ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم

"سفر جاری ہے" دلچسپ، معلومات افزا، متنوع اور کارآمد کتاب ہے اور اہل ذوق کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔"

سعید بدر

"سفر جاری ہے" کسی پاکستانی ناشر کی پہلی خودنوشت سوانح ہے۔ جو میرے مطالعہ میں آئی ہے۔ میں ملک مقبول احمد کو اس اعزاز پر مبارک باد دیتا ہوں۔"

پروفیسر سجاد نقوی

"سفر جاری ہے" سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے سیکھنے کے لیے بھی بہت کچھ ہے، آخر زندگی صرف اچھا شعر کہنے یا اچھا افسانہ لکھنے کا نام ہی تو نہیں ہے، اچھا انسان بن کے دکھانے کا نام بھی تو ہے۔"

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

"ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے، خودنوشت کا ہر صفحہ ان کے کثرت مطالعہ ومشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔"

علی سفیان آفاقی

"اس کتاب میں ملک مقبول احمد کو کبھی بارگاہ ایزدی میں دیکھا، کبھی بارگاہ رسالت مآبؐ میں، کبھی عشق کے کارزار میں اور کبھی رزم گاہ حیات میں ان کا نظارہ کرتا رہا اور میری نگاہیں چکاچوند ہوتی رہیں۔"

سید واجد رضوی

"سفر جاری ہے" کوئی مافوق الفطرت تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک جیتی جاگتی جدوجہد کرتی زندگی کی کم وبیش نصف صدی سے زیادہ عرصے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی دیومالا ہے۔"

اسرار زیدی

"یہ خودنوشت پڑھنے والے کو ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانے میں بھی یقیناً مددگار ثابت ہوگی، جو بڑے ادب کی ایک بڑی خوبی ہے۔"

اکبر حمیدی

"سفر جاری ہے" بظاہر ایک غیر ادیب کا تخلیقی اثاثہ ہے، ہر زندہ تخلیق کی طرح اس میں ایک بھری پُری زندگی اپنی تجسیم سے اپنا اثبات کرنے میں کامیاب رہی ہے۔"

پروفیسر منور عثمانی

"جس طرح بے دوگ صداقتوں اور سچائیوں کو واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب ہر طبقے کے افراد کے مطالعہ کے لیے ازبس ضروری ہے۔"

پروفیسر مظفر مرزا

"یہ ایک ایسے انسان کی سرگزشت ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں، غیر رسمی مطالعہ، مشاہدہ اور پیہم کوشش، محنت اور لگن سے "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔" کی عملی تفسیر بن گیا۔"

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی

"ملک مقبول احمد نے جو کہا وہ اس لیے سچ ہے کہ وہ افسانے نہیں لکھتے، ڈرامے نہیں بناتے ان کے نزدیک زندگی ایک سچائی ہے اور وہ اسے سچائی کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔"

جاوید اختر بھٹی

"جتنی دلیری سے آپ نے "سفر جاری ہے" لکھی ہے یہ صرف آپ ہی کا اعزاز ہے ایسی سیدھی سادی اور پُرخلوص کتاب لکھنے پر مبارکباد ہی پیش کی جا سکتی ہے۔"

محمد ایوب خان

"یہ عطا نہیں تو کیا ہے کہ "سفر جاری ہے" ملک مقبول احمد کی اوّلین کتاب ہے، مگر اس میں کچا پن لاکھ کوشش سے بھی نہیں ملتا، تسلسلِ فکر کہیں کج فہمی کا شکار نہیں ہوتا۔"

جان کاشمیری

"اُمید ہے کہ ملک مقبول احمد کی یہ کاوش پذیرائی حاصل کرے گی اور بہت سے لوگوں کے لیے رہنما کتاب ثابت ہوگی۔"

زاھد حسین انجم

"یہ کتاب مسلسل جہاد اور تعمیر مسلسل کی عملی تصویر ہے اس کے مطالعہ سے قاری کے دل میں اُمید کی کرن اور اُمنگ جنم لیتی ہے۔"

ڈاکٹر اللہ بخش ملک

"یہ خودنوشت سچائی، سادگی، سلاست اور کردار کی منہ بولتی تصویر ہے۔"

اعتبار ساجد

"سفر جاری ہے" غریب و سادہ بھی ہے اور رنگین بھی، اسلوبِ نگارش میں رومان کا رنگ بھی ہے اور تلخی حیات کا انگ بھی۔"

ظفر علی راجا

"سفر جاری ہے" مشعلِ راہ ہوگی، میرے جیسے ان بے شمار لوگوں کے لیے جو اپنے زورِ بازو سے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔"

انیس یعقوب

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اُردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار کی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک مکمل خودنوشت کی تمام صفات موجود ہیں۔"

ڈاکٹر اختر شمار

"یہ ایک اعلیٰ پائے کی آپ بیتی ہے، اس میں رومان بھی ہے اور سچی زندگی کی عکاسی بھی، اس وجہ سے یہ آپ بیتی دل میں اُترتی ہے اور قاری کو ساتھ لیے چلتی ہے۔"

پروفیسر عثمان علی

"سفر جاری ہے" ایک غیر معمولی دستاویز ہے، جس سے رعنائی خیال عمق فکر اور سادہ بیانی کے ساتھ ماضی کی یاد آفرینی دل میں اُتر جاتی ہے۔"

نقشبند قمر نقوی

"بچپن، جوانی اور عملی زندگی کی جدوجہد کو انتہائی ذمہ داری سے خوبصورت پیرائے میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔"

ناصر نقوی

"سفر جاری ہے" فنِ کتاب سازی کی دشوار گزر راہوں کی نشان دہی کرتی ہے۔"

بشیر موجد

"سفر جاری ہے" میں ناول کی چاشنی موجود ہے، لفظوں کی بندش اور جملوں کی ترتیب و ساخت نے کتاب کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ شروع کرنے کے بعد مکمل کیے بغیر چھوڑنا ممکن نہیں رہتا۔"

علوا اصغر

"سفر جاری ہے" میں زندگی کے تمام رنگ، شوخ، پھیکے، ہلکے، گہرے اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

شبہ طراز

"ایک ایسے اشاعتی ادارے کے مالک کی یہ خود نوشت جس کا اشاعتی قبلہ نوائے وقت کے الفاظ میں درست ہے، کئی حیثیتوں میں ایک ممتاز کتاب ہے"۔

حافظ صفوان محمد چوہان

"ان کے اندازِ نگارش پر ادبی رنگ چھایا ہوا ہے، بیان سادہ ہے، طرزِ تحریر میں دل گرفتگی اور قاری کو جذب کر لینے کی صلاحیت موجود ہے۔"

باقی احمد پوری

"یہ ایک بے حد کھلے دل و دماغ کے سادہ مزاج، محبت کرنے والے اور زندگی کی ہر آزمائش سے خوشبو اور رنگ کشید کرنے والے شخص کی داستان ہے۔"

سلمیٰ صدیقی

"سفر جاری ہے" نئی نسل خصوصاً وہ نوجوان جو اپنی دُنیا آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ان کے لیے مشعلِ راہ اور درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

علامہ عبدالستار عاصم

"سفر جاری ہے" ایک دلچسپ اور کامیاب تخلیق ہے اور دوسری خود نوشت سوانح عمریوں سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی ہے۔

پروفیسر اشفاق رشید

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے کٹھن آزمائشوں میں اپنے اندر کے تخلیق کار کو زندہ رکھا اور اپنی تخلیق میں اپنے کاروباری تجربات کو پُرکاری سے بیان کیا ہے۔"

قاضی ذوالفقار احمد

"ایک اچھی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اگر آپ اسے پڑھنا شروع کریں تو چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔"سفر جاری ہے" کئی ہی ایک منفرد کتاب ہے۔"

ثریا کے ایچ خورشید

"سفر جاری ہے" ایک منفرد آپ بیتی ہے مصنف نے اپنی عملی زندگی اور مشکل مرحلوں کی داستان بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کی ہے۔

بلقیس ریاض

"زندگی کا اعمال نامہ یا پھر کتابِ زیست۔
لیکن یہ ایک مضبوط حقیقت ہے کہ مصنف نے منفرد اور انوکھے انداز میں اُردو ادب کے قاری کو ایک ادبی دستاویز تحفے میں دی ہے۔"

طارق شاہین

"سفر جاری ہے" ملک مقبول احمد کی پہلی کاوش ہونے کے باوجود ایک معیاری کتاب ہے۔ یہ ان کی زندگی کی کہانی ہے، جس میں رشتوں کی چاشنی بھی ہے اور رشتوں ہی سے ملنے والی حوصلہ شکنی بھی ہے جسے پڑھ کر قاری ان کی ہمت اور کامیابیوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شہزاد منیر احمد گروپ کیپٹن (ر)

"ملک مقبول احمد کی آپ بیتی پر سینکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں کیونکہ ان کے اسلوب میں ڈپٹی نذیر احمد ایسی سچائی خود بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ان کا رومان...... اے حمید کے ناولوں کی رومانوی یادوں کی طرح سحرانگیز مہک سے لبریز نظر آتا ہے۔"

صائمہ نورین بخاری،

"سفر جاری ہے" اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے کہ اس کتاب کے لکھنے والے کو ادیب ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں لیکن کتاب پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تحریر پر ملک مقبول احمد کی گرفت جتنی مضبوط ہے، لکھنے پر ایسی دسترس کسی بڑے بڑے جغادری ادیب کو بھی کیا حاصل ہوگی۔"

محمد آصف بھلی

"ملک مقبول احمد کی خودنوشت میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، ان کی تحریر میں پہاڑی جھرنوں جیسی روانی اور نغمگی ہے، ہمیں اس کتاب سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو مشکلات سے گھبرانے کی بجائے عزم و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

انوار فیروز

"ایک اچھی کتاب کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کے ذہن و دل کو پڑھتے ہی فوراً اپنی گرفت میں کر لے۔ "سفر جاری ہے" ایک دلچسپ سوانح عمری ہے جو پڑھنے والے کو نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔"

پروین طارق

"ملک مقبول احمد نے مصلحتوں سے سمجھوتا کرنے کے بجائے جو کچھ محسوس کیا اور جس کا مشاہدہ کیا، انہیں بے کم و کاست صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ "سفر جاری ہے" کو بجا طور پر اردو آپ بیتیوں کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

"سفر جاری ہے" کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، شگفتگی بھی اور روانی بھی، فصاحت بھی اور بلاغت بھی، سحر بھی ہے اور تاثیر بھی، مصنف کو منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے فن میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔"

رئیس الدین رئیس (بھارت)

"سفر جاری ہے" میں ملک مقبول احمد نے اپنے بارے میں وہ سب واقعات، تجربات، جگ بیتی و ہڈ بیتی، خاندانی کوائف و مرحلہ وار ترقی کے تمام کوائف جمع کر دیے ہیں جو کسی بھی سوانح یا خودنوشت سوانح میں ہونے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد

"سفر جاری ہے" کسی پبلشر کی پہلی خود نوشت ہے۔ اس آپ بیتی پر پروفیسر جمیل آذر جیسے جید ادیب نے "راہ نوردِ شوق" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے۔ "سفر جاری ہے" اُردو آپ بیتی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

شفیع ہمدم

ملک صاحب نے علم و ادب کے فروغ کو اپنا مشن بنایا اور کامیاب رہے۔ موجودہ عہد میں اُردو میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں ملک مقبول احمد کی آپ بیتی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ "سفر جاری ہے" ایک ایسا نام ہے۔ جس کے اندر کئی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔"

صابر آفاقی

"سفر جاری ہے" پڑھ کر میں نے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی اور زندگی نام ہے جہد مسلسل کا اور عمل پیہم کا۔ میں نے اس کتاب کو نہ صرف دلچسپ، خوش گوار اور انبساط انگیز پایا۔ بلکہ ایک رہنمائی کرنے والی تصنیف بھی پائی۔

عثمان تبسم ذاکر

"سفر جاری ہے" ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں حقانیت کے غنچے چٹکتے ہیں اور صداقت کی بادِ بہاری خرام ہے۔ یہ آپ بیتی تو ایک جگ بیتی ہے جس کے کردار چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ سچ جانیے یہ کئی سیلف میڈ انسانوں کی آپ بیتی ہے۔"

گوہر ملسیانی

"ملک مقبول احمد ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ "سفر جاری ہے" ان کی زندگی کے سفر کی کہانی ہی نہیں بلکہ یہ ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے۔ کتاب کیا ہے۔ انکشافات کا ایک پوٹلیا ہے۔"

ڈاکٹر معصوم شرقی (بھارت)

"سفر جاری ہے" میں ملک مقبول احمد نے اپنا زندگی نامہ پیش کیا ہے۔ جو ان کی محنت و مشقت اور عملی زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنے کی داستان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سوانح افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔"

نوائے وقت

""مصنف نے قاری پر کہیں بھی اپنی علمیت کا بوجھ نہیں ڈالا، جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں، وہ انہوں نے بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے کہہ ڈالی ہے۔"

قائم نقوی

""کسی ناشر کی میری نظر سے گزرنے والی یہ پہلی سوانح حیات ہے جو کئی بڑے ادیبوں کی لکھی سوانح حیات پر بھاری ہے۔"

ڈاکٹر کیول دھیر

"ملک مقبول احمد کی اس کتاب کے اندازِ نگارش نے ناشرین اور مصنفین کے درمیان ایک صحت مند مقابلے کی فضا بھی پیدا کر دی ہے۔"

پروفیسر تنویر حسین

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے گود سے لے کر عہد حاضر تک اپنی عملی زندگی کے تمام تجربات کو مختصر قرطاس پر منتقل کر کے قاری کو ایک انمول تحفہ پیش کیا ہے۔"

کنول عاصم

"سفر جاری ہے" اس اعتبار سے ایک مختلف کتاب ہے کہ یہ سفر نامہ بھی ہے اور آپ بیتی بھی اسے پڑھ کر پورے عہد کی تہذیبی تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔

ریحانہ قمر

"سفر جاری ہے" ملک مقبول احمد کے تخلیقی سفر کا بھی آغاز ہے، میری خواہش ہے وہ اس سفر کو جاری رکھیں تا کہ ہم جیسے قارئین کو سچ اور پورا سچ پڑھنے کو ملتا رہے۔"

عمرانہ مشتاق

"سفر جاری ہے" میں مصنف نے نہ صرف اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کی ہے بلکہ اس وقت کے گلے سڑے سماج کا بڑی چابک دستی سے نقشہ کھینچا ہے۔"

قمر یورش

ملک صاحب! آپ کی کہانی نے مجھے مخمور کر دیا۔ بیان کی سادگی، روانگی اور سلاست جو تصنع اور بناوٹ سے پاک اور عجز، انکساری اور سچی وارداتوں کا مجموعہ ہے نے دل و دماغ کو بہت طراوت بخشی۔

اشفاق احمد

آپ کی آپ بیتی "سفر جاری ہے" اپنی نوعیت کی منفرد، دلکش اور اپنی مثال آپ ہے۔ یہ آنے والی نسل کے لیے تحریک بھی ہے اور تاریخ بھی۔

ایم آر شاہد

ملک مقبول احمد صاحب! نے اپنی زندگی کے جاری سفر (جو کہ عربی کا سفر ہے) کے غیر مقبول لمحات خصوصاً جو انگریزی "سفر" کے حوالے سے بھی ہیں دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے۔

حافظ حسین احمد

"ملک مقبول احمد کے جاری سفر کی مطالعاتی مسافرت نے اُن کی شخصی قد و قامت کا خوب تعارف کرایا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک خوش بیان داستان گو کی صفات کے حامل ہیں۔ یہ ہر عمر کے قاری کے لیے ایک قابل مطالعہ عمدہ کتاب ہے۔"

دردانہ نوشین خان

اس کی تحریر میں جو ندرت و دلربائی ہے
شاعروں اور ادیبوں کو بہت بھائی ہے
گو مری ان سے ملاقات نہیں لیکن اب
ایسا لگتا ہے کہ مدت سے آشنائی ہے

سید سلیمان گیلانی

یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا کچا چٹھا عوام کی عدالت میں پیش کر دے لیکن الحمدللہ سفر جاری میں ایک ایسا آدمی نظر آتا ہے جو ادیب نہ ہونے کے باوجود خوبصورت اور منجھا ہوا ادیب لگتا ہے تحریر میں بہت چاشنی ہے۔

ابوالعمار بلال مہدی

"سفر جاری ہے" میں آپ نے جس سادگی، خلوص اور سچائی سے مختصر حیات مستعار کے شب و روز کو الفاظ میں ڈھالا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز سے جس طرح آپ نے پنجہ آزمائی کی اور ہمت کی پتوار تھامے رکھی، وہ قابل ستائش ہے۔

عبدالقیوم

"سفر جاری ہے" ملک مقبول احمد کی اتنی دلچسپ سرگزشت ہے کہ یہ ضخیم کتاب میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ اس کتاب کے ہر باب میں ایک سے ایک انوکھی داستان ہے۔ یہ مفید عام کتاب ہر لائبریری کی زینت ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔

شاھد بخاری

"سفر جاری ہے" بے حد دلچسپ ہے۔ آپ نے اپنی دُنیا آپ پیدا کی ہے اور دیگر لوگوں کو بھی اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا پیغام دیا ہے۔ ان سب کے لیے اس میں ایک ایسا سبق ہے کہ اگر سمت درست ہو تو جہدِ مسلسل سے انسان منزل پالیتا ہے۔

رانا عامر رحمٰن محمود

"سفر جاری ہے" حسنِ بیان کی سادگی اور بے تکلفانہ انداز میں ادب کا ایک دلکش مرقع ہے۔ جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ یہ ایک غیر معمولی دستاویز ہے۔ اس کی اشاعت پر میں ملک مقبول احمد صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

مقصود احمد چغتائی

"سفر جاری ہے" یہ نام ہے ایک ایسی نادر اور مبنی برحقیقت کتاب کا، جس کے طابع اور سوانح نگار خود ملک مقبول احمد اعوان (قطب شاہی) ہیں۔ حال اس کتاب کی مقبولیت کا یہ ہے کہ اس کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے ہیں۔

میاں محمد سعید شاد

سادگی، پرکاری اور عجز و انکساری کی سیاہی سے لکھی گئی ملک مقبول احمد کی خودنوشت "سفر جاری ہے" ان کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کا ذریعہ ہی نہیں ان کے جذبات و احساسات سے مکمل آگاہی کا وسیلہ بھی ہے۔

حکیم محمد عزیز الرحمن جگرانوی

"سفر جاری ہے" کچی مٹی کی طرح ایک من موہنی مہک کی حامل ہے اور یہ مہک دراصل اس بے ساختہ سچ کی مہک ہے جو سچ اس خودنوشت کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر علامہ سید اعجاز ظہیر ہاشمی

Malik Maqbool Ahmad has managed to pen a gripping account with utmost candidness. It not only reflects his own personality but also serves as a running commentary on the cultural and literary activities of his times.

Ashfaq Naqvi

This scribe has witnessed the fact that Malik Maqbool Ahmad has also got himself educated through the untraditional means as well, through experience and through the company of the literate ones.

Amjad Pervaiz

His memories do not include a record of his achievement they are a saga of the life and development of an undoubtedly brilliant publisher.

Rabbia Arshad

ملک مقبول احمد





آرمغانِ غزل

نامور ادبی شخصیات